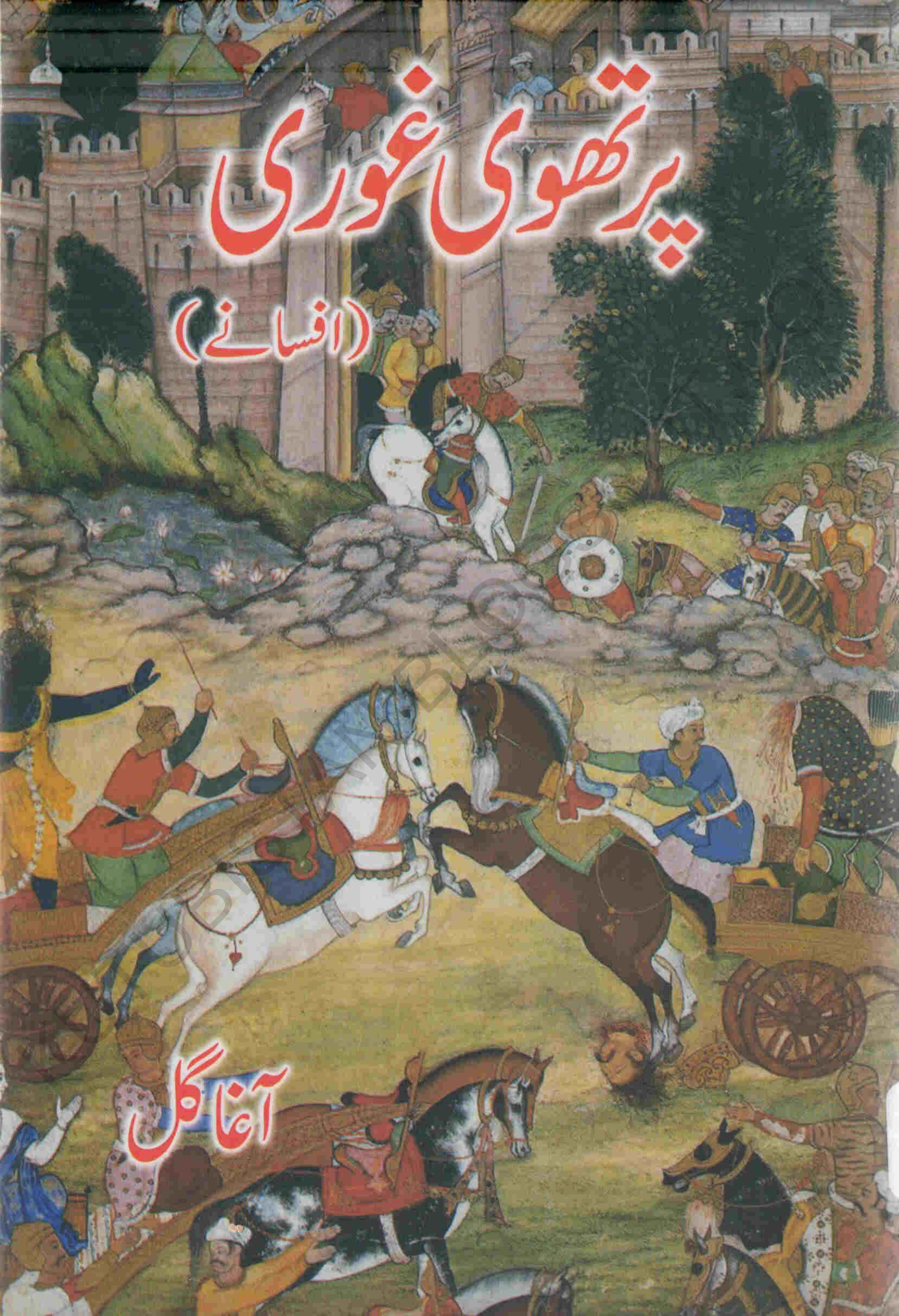

پرتھوی غوری
(افسانے)
آغا گل

پرتھوی غوری

(افسانے)

آغا گل

دُعائے حق پبلی کیشنز
ہیڈ آفس: 2-A سید پلازہ چیٹرجی روڈ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37220631
سب آفس: 25 سی لوئر مال لاہور۔ فون: 042-37325418

ملنے کا پتہ
گوشۂ ادب
جناح روڈ کوئٹہ۔ 081-2820375

فہرست

زباں اور

مجھے کبھی بھی کوئٹہ شہر اچھا نہ لگا۔ تین پہاڑوں کے درمیان پیالہ نما وادی میں بسا بے ہنگم شہر جسے ایک بار خالق نے خاک میں ملا دیا، اذانِ فجر سے بہت پہلے جب کہ سبھی سو رہے تھے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تباہ شہروں کی مانند اسے عبرت کدہ بنائے رکھنے کی بجائے انگریزوں نے دوبارہ یہ شہر بسا دیا۔ یہ ان کے Colonialism کا مرکز تھا' بھلا وہ یہ ٹاپو کیوں بلوچستان میں ڈوبنے دیتے۔ اس شہر کا اپنا کچھ بھی نہ تھا' سردیاں شمال سے آتیں۔ بارشیں بحیرہ عرب سے مگر جنوب سے حاکم مشرق سے! مجھے کوریئر کمپنی میں منیجر کی اسامی مل گئی۔ شہر کے گنجان علاقے میں واقع تین منزلہ عمارت کی تیسری منزل پہ ایک معقول سا فلیٹ مل کرایہ پہ لے لیا۔ پلازہ کا منیجر بنس مکھ انسان تھا۔ اس کا غبی سا بیٹا میٹرک میں تسلسل سے فیل ہو رہا تھا۔ اسے بلا معاوضہ ٹیوشن پڑھانے لگا۔ منیجر بہت ہی مہربان ہو گیا۔ رات کا کھانا باقاعدگی سے بھجوانے لگا۔ چند ہی ماہ بعد جب اس کے بیٹے اسد نے داخلہ ٹیسٹ پاس کیا تو منیجر خوشی سے مغلوب ہو گیا۔ اس نے ماہانہ کرایہ معاف کر دیا۔ صبح کا ناشتہ بھی

بھجوانے لگا۔ دوپہر کا کھانا کوریئر کمپنی کی جانب سے ملا کرتا۔ موٹر سائیکل بھی کمپنی نے ہی لے دی۔ فلیٹ کے لئے اقساط پہ ٹیلی ویژن' فریج اور مائیکروویواوون بھی حاصل کرلیا۔ ان چیزوں کی موجودگی میں بیوی کی ضرورت نہیں رہتی۔ منیجر پلازہ لال بخش چونکہ میرا احترام کرتا' پورا پلازہ ہی دوستانہ انداز میں پیش آیا کرتا' حتیٰ کہ باہر تھڑوں پہ بیٹھے نجومی' رمال' سبزی کے ٹھیلے والے بھی میری عزت کرنے لگے۔ لال بخش لحیم شحیم انسان تھا' کوئی کرایہ دار ایک دو ماہ کرایہ ادا نہ کرتا تو اسے باہر پھکوا دیتا سامان ضبط کرلیا کرتا۔

میری زندگی تو سکون سے گزر رہی تھی۔ البتہ شہر میں ایک طویل شب برات منائی جارہی تھی۔ راون زندہ تھا مگر دیوالی کا جشن عروج پہ تھا۔ سرِ شام دھماکے ہونے لگتے۔ انسانوں کے چیتھڑے بکھر جایا کرتے۔ پٹاخے چلتے پھلجڑیاں بہار دکھاتیں۔ میں کروٹ بدل کے سو جایا کرتا۔ میری ترقی ہونے کو تھی۔ لوگ مرتے ہیں تو میں کیا کروں کاسی قبرستان صدیوں سے انسانوں کو نگل رہا ہے۔ میرا مقصد حیات ایک آرام دہ زندگی گزارنا تھا۔ میں اپنی زبان بند ہی رکھتا تھا۔ چھوٹی سی زبان ایک طویل زندگی کے امکانات ختم کردیتی ہے۔ زبان اتنی خطرناک ہے جانے چہرے پہ کیوں ہے۔ پیروں میں بھی تو ہوسکتی تھی۔ بوٹ میں دابے رہتے۔

ان ہی دنوں میرا دوست ایوب میرے گاؤں سے چلا آیا۔ وہ نوکری کا متلاشی تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی منشی لال خان سے بھی ملوایا۔ وہ حاتم طائی جیسا دیالو تھا' پر تکلف دعوت کرڈالی۔ ایوب کے آنے سے کوئی اپنا مل گیا۔ اتنے بڑے شہر میں اکیلا پن بہت کھلتا ہے۔ میرے پاس تو کمپیوٹر خریدنے کے پیسے نہ تھے۔ ایوب نیچے بازار میں نیٹ کیفے چلا جایا کرتا۔ جانے کہاں کہاں ملازمت کی درخواستیں بھجوایا کرتا۔ اون لائین

کے علاوہ ڈاک سے بھی درخواستیں پوسٹ کیا کرتا، بن سنور کے انٹرویو دینے جایا کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کی شوخی و خوش گفتاری گہنا سی گئی۔ میں شام میں لوٹتا تو وہ ٹیلی ویژن آف کیے مہاتما بدھ کی مانند آنکھیں بند کیے۔۔۔ جانے کن سوچوں میں ڈوبا رہتا۔ میری آواز پہ چونک سا اٹھتا۔ اس کا دماغ بھی کچھ کھسک سا گیا تھا بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔

''ایوب! یار کچھ بولو' اپنی زبان بول کے دل خوش ہوتا ہے۔''

''زبان!'' وہ ہڑبڑا کے مراقبے سے اٹھ بیٹھا۔ ''ابتداء میں کلام تھا' کلام خدا کے ساتھ تھا۔ خدا کلام تھا۔''

''یہ کیا تقریر شروع کردی'' میں نے دوستانہ احتجاج کیا۔

ایوب نے ڈپٹ دیا۔ ''خاموش بے ادب! یہ کتاب مقدس کے الفاظ ہیں۔ لفظ ہمیں خدا نے دیئے ہیں۔''

میں ہنس دیا۔ ''صرف لفظ دیئے ہیں روٹی کیوں نہیں دی؟ بھوک کے مارے لوگ مرجاتے ہیں۔ جب کہ گونگے زندہ رہتے ہیں۔''

ایوب کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ ''میں چاہتا ہوں انسان کی زبان ہی نہ ہو۔ ڈاروِن نے یہ نہیں بتایا کہ بن مانس نما انسان کی زبان کب اُگی؟ یہ لایعنی چیز کب نکلی۔ جیسے مگرمچھ لاکھوں برس بعد سانپ میں منقلب ہوگیا۔ ہوسکتا ہے کسی اندرونی عضو نے باہر نکل کر زبان کی صورت اختیار کرلی ہو؟ اور تم جھوٹ کہتے ہو بھوک سے اتنے انسان نہیں مرتے جتنی اموات زبان کے باعث ہوتی ہیں۔''

اتنے میں لال بخش چلا آیا۔ ''چلو کھانا تیار ہے۔'' ہم دونوں فوراً ہی ساتھ ہولیے۔ کھانے کے بعد ایوب کے دل کے پھپھولے پھوٹ گئے۔ بات شادی کی چل نکلی تھی میری شادی کا پوچھا پھر ایوب سے یہی سوال دہرایا۔ ایوب پہ قنوطیت

طاری تھی۔ ''جسے چاہتا تھا اس کی زبان کچھ اور تھی انہوں نے انکار کر دیا اب تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔''

مجھے ایوب کے بدلے ہوئے رویئے سے تشویش ہونے لگی کہیں اس کی انتہا پسندی کوئی نیا گل ہی نہ کھلا دے۔

اگلی رات حسب معمول شہر چار دھاکوں سے گونج اٹھا۔ ایوب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''دھماکے ہو رہے ہیں۔ انسان ہی انسانوں کو مار رہے ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں۔ دل چاہتا ہے اس شہر کے تمام انسانوں کی زبان ہی کاٹ ڈالوں زبانوں کی نفرت ختم ہو جائے گی۔ زبان ہی تو نفرت پھیلاتی ہے۔''

میں نے بمشکل اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ فلیٹ میں چونکہ جگہ کم تھی میں پلنگ پہ سویا کرتا اور وہ زمین پر بستر لگا کر۔ مجھے دن بھر کام کرنا ہوتا۔ جب کہ ایوب بالکل بیکار رہتا تھا۔ مجھے جھلاہٹ بھی ہوا کرتی کہ میرا بازو بننے کے بجائے وہ ایک بوجھ بنتا جا رہا ہے۔

اس کی جلی کٹی باتیں سن سن کر کان پک گئے تھے۔ سنجیدگی سے سوچا کرتا کہ اسے کسی طرح چلتا کروں۔

رفتہ رفتہ ایوب کے چہرے پہ پژمردگی سی چھانے لگی۔ اس کے چہرے پہ نومبر اتر آیا۔ ایک زردی بجھی بجھی دھوپ اس کے چہرے پہ گھٹا کیے رہتی۔ اب وہ براہوی زبان میں گفتگو سے احتراز کرنے لگا تھا۔

''میری زبان ہی آڑے آتی ہے۔ میری زبان ہی کے سبب مجھے ملازمت نہیں دی جاتی۔ زبان زبان زبان کاش میری ماں گونگی ہوتی۔ میری کوئی مادری زبان نہ ہوتی۔''

میں نے گفتگو کو مزاحیہ رنگ دینا چاہا۔ ''معذوروں کا کوٹہ دو فیصد مقرر ہے ملازمتوں میں۔ اگر تم گونگے ہوتے تو کب کے افسر اعلیٰ بن چکے ہوتے۔''

ایوب چونک اٹھا۔ ''زبان سے چھٹکارہ پایا جا سکتا ہے۔ مجھے تو خیال ہی نہ آیا۔ پاکستان کا وزیر اعظم غلام محمد مفلوج تھا زباں بند تھی۔ بڑی کامیابی سے ملک چلاتا رہا۔ واہ کیا بات ہے۔'' وہ بستر لپیٹ کر چھت پہ سونے چلا گیا۔

کبھی آسمان سے تجلیات اترا کرتیں۔ اب تو اندھی گولیاں برستی رہتیں۔ ایوب کو بارہا منع کیا مگر وہ سنی اَن سنی کر کے چھت پہ سونے کیلئے چلا جایا کرتا اس کی باتیں سن سن کر جی ہلکان ہونے لگتا۔ پھر مجھے مزید اذیت دینے کیلئے چھت پہ سونے جاتا۔ طبیعت اوب سی جاتی۔ تردد دور کرنے کے لئے میں مار دھاڑ کی فلمیں لگائے رکھتا۔ اور پھر کروٹ بدل کے سو رہتا۔

شب برات کے تین دھماکے ہوئے۔ میں اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ نیند اچاٹ نہ ہوتی میں کچھ ہی دیر میں دوبارہ سو جایا کرتا۔ اتنے میں ایوب چلا آیا۔ مجھے جھنجھوڑ کر جگانا چاہا حالانکہ میں پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ٹپک رہی تھی۔ سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ مارے دیوانگی کے وہ مجھے اجنبی اجنبی سا لگا۔ پاگلوں کا سا انداز تھا۔ وحشی سا۔ ''بتاؤ اس شہر میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟'' اس کا جنونی انداز مجھے خوفزدہ کر رہا تھا میرا حلق خشک ہونے لگا۔ مجھے خوفزدہ پا کر وہ اور بھی شیر ہو گیا'' بتاؤ مجھے۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ میں منمنانے لگا ''بلوچ' براہوی' دیہواری، مکرانی، ہزارگی' سندھی' پنجابی' پشتو...... اور۔'' میری زبان گنگ ہو گئی یونہ۔

اس نے جیب سے استرہ نکال کر کھول لیا تھا۔ ''میرے ساتھ چلو چھت پہ۔'' وہ غرایا۔ میں سہما سہما ساتھ ہو لیا کہ بگڑ کر کہیں میرا نرخرہ ہی نہ کاٹ ڈالے۔ چھت پہ نسبتاً خنکی تھی

لوڈشیڈنگ کے باعث شہر پہ ظلمتوں کا سایہ تھا۔سیاہ رات تنی ہوئی تھی۔ بم دھماکوں سے خوفزدہ شہری گھروں میں دبکے ہوئے تھے شہر بھر پر کتوں کا راج تھا۔

ایوب کے لہجے سے میں خائف ہو رہا تھا۔

سنگ ہاراشندندو سگاں راکشاوند سنوشہر پہ میں کتوں کا راج ہے۔ان کی زبان ایک ہی ہے۔سنو! ایک ہی ہے کیا۔'' میں نے کان دھرا تو مجھے پہلی بار علم ہوا کہ واقعتاً سارے کتوں کی ایک ہی زبان ہے۔میرا جسم سرد پڑ چکا تھا مارے خوف کے ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔جی کڑا کر کے تصدیق کی۔''ہاں ان سب کی ایک ہی زبان ہے نسلیں اور شکلیں مختلف سہی مگر زبان ایک ہے۔سبھی آواز میں آواز ملا کر یک زبان ہو جاتے ہیں۔''

ایوب با آواز بلند بولا۔'' مجھے بھی آج ہی علم ہوا کہ کتوں کی زبان ایک ہے۔ صرف ایک۔'' ایوب نے بائیں ہاتھ سے اپنی زبان باہر کھینچی اور دائیں ہاتھ سے استرہ چلا دیا۔

چنگش تول

(2) سیوی دراصل بلوچستان کا ''ب'' کا نقطہ ہے۔ پہلو میں دریائے ناڑی بہتا ہے۔اہل سیوی کو پیٹ بھر پانی ملتا ہے۔جس کے باعث مزاج میں عجب طنطنہ اور طبیعت میں افتخار ہے۔ایسے من چلے ہیں کہ کسی نئی تفریح کسی نئے ایڈونچر کی تلاش میں رہتے ہیں۔شاعری میں بھی فرماتے ہیں ''سیوی گوڑوی گرداں بات''(3)

کھیل تماشے' سرکس کے بھی شیدائی ہیں۔شیکسپیئر کے گولڈن تھیٹر کے بعد شاید سب سے زیادہ ڈرامے اہل سیوی نے ہی پیش کیے۔ سیوی کالج میں تعیناتی ہوئی تو میں بھی ڈرامے پیش کرنے لگا۔بشیرامشہور ومقبول اداکار تھا۔کچھ اردھانگنی والا معاملہ تھا وہ مرد و عورت کا ایک حسین امتزاج تھا ویسے مرد' وہ کم ہی دکھائی دیتا۔ یہاں سال میں ایک بار سردیوں میں سالانہ میلہ لگتا ہے۔صدیوں سے دستور چلا آتا ہے کہ سرباز اور شاہسوار بارکھان کے یا عربی النسل گھوڑے خریدنے آتے۔ زمیندار بھاگ ناڑی نسل کے بیل خریدتے۔ ہمارا دور آیا تو گدھے گھوڑے غائب ہوئے' اسلام آباد سے حاکم گھوڑے گدھے خریدنے کی بجائے محض سیاستدان خریدنے آیا کرتے۔ بازار

گرم ہوتا۔ ہارس ٹریڈنگ ہوتی۔ بلوچستان بھر میں کہیں پکچر ہاؤس نہیں جہاں بھٹک پڑے۔ راتوں رات نہایت مرصع ومقفیٰ وال چاکنگ ہوجاتی ہے۔

"فیلم چلے گی سینما جلے گی۔"

سیوی کے میلے میں عوام کی دلچسپی کیلئے ہیجڑے اور سیاستدان بلوائے جاتے۔ سیاستدانوں کی تقریروں اور ہیجڑوں کے کولہے مٹکانے سے عوام بہت خوش ہوتے۔ ۔سیاستدانوں کے علاوہ سرکس' موت کا کنواں اور منڈوہ بھی بلوایا جاتا۔ان دنوں سٹیج ڈرامے بھی پیش کیے جاتے۔ جن میں بشیرا کو نسوانی کردار دیا جاتا۔کبھی وہ' لیلیٰ بنتا کبھی انارکلی۔ مسلسل زنانہ کردار ادا کرتے رہنے کے باعث اس کی حرکتیں بھی انارکلی والی ہوگئی تھیں۔انارکلی ایک جانب اکبر بادشاہ سے فلرٹ مارتی دوسری جانب شہزادہ سلیم کی محبت کا دم بھرتی۔ان دنوں میں سیوی کالج میں اردو کا لیکچرار تھا۔اہل شہر کو اردو بھی اسی قدر مشکل لگتی جیسے کہ سنسکرت یا لاطینی۔لہٰذا میری علمیت کے باعث وہ میری عزت کیا کرتے۔ کہنے کو تو میں اردو کا اکلوتا لیکچرار تھا مگر اپنے کمرے کے باہر اور اپنے پیڈ پہ میں نے نام کے ساتھ صدر شعبہء اردو لکھوا رکھا تھا۔جس سے لوگوں کے دل دہل جایا کرتے۔

سیوی کا میلہ قریب تھا کہ ایک روز ہمارے پرنسپل کو نائب تحصیلدار نے بلوا بھیجا ۔گھنٹہ بھر روکے رکھا۔ آتے میں قدم اور تھے۔اس کا 70CC ہنڈا آہیں بھرتا کالج میں داخل ہوا۔فوراً میٹنگ طلب کی۔ عالم وحشت میں خبر سنائی کہ امسال سیوی میلہ میں کالج کی جانب سے بھی ایک ڈرامہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پرنسپل ایک آہِ سرد کھینچ کے بولا۔" یہ جو تم نے کالج میں ڈرامیٹک سوسائٹی کھول رکھی ہے۔ یہ غیر اسلامی بھی ہے اور غیر شرعی بھی۔ میں برداشت کرتا رہا۔ بشیرا جیسے لوگ غضب خدا کا کالج

آتے جاتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اس کی موجودگی محمود غزنوی کے حملوں سے کم نہیں۔ اب ہمیں ایک ڈرامہ پیش کرنا ہوگا۔ جسے وزیر تعلیم دیکھیں گے۔اور شرطیں سنو گے تو کھوپڑی ناچ جائے گی۔"

میں نے پرنسپل کو اعتماد میں لیتے ہوئے جواب دیا۔" آپ فکر نہ کیجئے۔شرائط کہیے کیا عائد ہوئی ہیں۔"

" ہمارے ہاں سٹیج پہ عورت نہیں دکھائی جاسکتی۔اس کا التزام رکھنا ہے۔کوئی سیاسی فقرہ نہ ہو ورنہ کالج کے باہر ہمیں پھر گنڈیریوں کی چھابڑی لگانا پڑے گی۔کڑی شرط یہ ہے کہ وزیر ڈرامہ دیکھ دیکھ ہنستا رہے۔کمبخت نے تو دھمکی بھی دی ہے۔"

ایک پروفیسر نے سوال کیا۔" آپ کو کیا گولی ماردیں گے۔" پرنسپل تاؤ کھا گیا "ارے گولی سے کون ڈرتا ہے۔ مجھے تو بس یہی ڈر مارے ڈالتا ہے کہ خفا ہو کر پنجگور یا خاران کا ہی پرنسپل نہ لگا دیں۔وزیر کو مسلسل کیسے ہنسایا جاسکتا ہے؟"

کیمسٹری کے پروفیسر نے دلاسہ دیا۔" میں لافنگ گیس ہال میں پھیلا دوں تو پورا ہال بھی کشتِ زعفران بن جائے گا۔وزیر مسلسل ہنستا رہے گا۔"

اسلامیات کا لیکچرار بے اعتباری سے ٹٹولنے لگا۔" کیا یہ ممکن ہے۔"

" کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ یہ معجزہ کر دکھائے گا۔" پروفیسر نے خم ٹھونک کے جواب دیا۔ ڈرامہ کسی پٹوراری نے لکھ کے بھجوا ہی دیا تھا۔ اسٹریٹ ڈرامہ ٹائپ تھا ویسے بظاہر ون ایکٹ پلے تھا۔

پرنسپل پھر کراہا۔" تاکید کی گئی ہے کہ ڈرامے میں اسلام کی سربلندی بھی ہو اور ہنسنا ہنسانے بھی ہو۔"

" کیا یہ ڈرامہ کسی امریکی وزیر نے دیکھنا ہے کیا۔" فوراً ہی سوال ہوا۔

"ارے نہیں بھئی اپنے ہی وزیر نے دیکھنا ہے۔ امریکہ اتنا بڑا اتنا امیر ملک ہے وہاں صرف چھ وزیر ہوا کرتے ہیں۔ ان کے پاس مزاحیہ ڈرامے دیکھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ اور امریکی ان پڑھوں کو وزیر بھی نہیں لگاتے۔" پرنسپل اردھانگی کی تفسیر بنا ہوا تھا۔

"کہانی سنائیے، پلاٹ کیا ہے۔" میری بیتابی بڑھتی جا رہی تھی۔ پرنسپل نے کاغذ میز پہ پھیلا دیئے۔

"کہانی یوں ہے کہ محمد بن قاسم سیوی میں راجہ داہر کے دربار میں آتا ہے، دعوتِ اسلام پیش کرتا۔ داہر کی ماں رانی سہانڑی مشورہ دیتی ہے کہ داہر اسلام قبول کر لے مگر داہر نہیں مانتا تلوار سونت کر حملہ کر دیتا ہے۔ محمد بن قاسم اسے مار ڈالتا ہے۔ رانی سہانڑی بین کرتی ہے کہ کیوں جنگ کی۔ اسلام کے جیالوں سے جیتا نہیں جا سکتا۔ پردہ گرتا ہے۔ چند نوجوان اسٹیج پہ آ کر نغمہ الاپنے لگتے ہیں۔ "چمکی قاسم کی تلوار او سن لے سیوی کے سردار۔ مسلمانوں سے لڑنا ہے دشوار۔"

"پہلا مصرعہ کچھ لمبا ہے۔" میں نے رائے دی۔

پرنسپل نے جھڑک دیا۔ "مصرعہ میں تلوار کی لمبائی بھی شامل ہے۔ آپ صاحبان کیا کہتے ہیں۔" نگاہ پروفیسروں پہ تھی۔

وائس پرنسپل نے پہلو بدلا۔ "ایسا ڈرامہ پیش کرنے کی بجائے میں تو خاران کالج کا پرنسپل بننا پسند کرتا۔ بلکہ دالبندین کالج کا پرنسپل بھی لگ جاتا۔"

مجھے اپنی علمیت کے مظاہرے کا اس سے بہتر موقع شاید نہ ملتا۔ "جی نہیں ہم ضرور ڈرامہ پیش کریں گے۔"

جب مجھے معلوم ہوا کہ ڈرامے کیلئے ایک لاکھ روپیہ میرے تصرف میں ہوگا تو

دلی خوشی ہوئی کہ اپنے موٹر سائیکل کے ٹائر بھی بدلوا لوں گا۔ موبائل بھی نیا لے لوں گا۔ یہ فنڈ دراصل لائبریری کیلئے مخصوص تھا۔ مگر کتابیں خریدنے کی بجائے وزیر موصوف کو ہنسانا ضروری تھا۔ یوں بھی کمپیوٹر کی وجہ سے طلباء کتاب کہاں پڑھتے ہیں۔

پورے ڈرامے میں داہر کی ماں کا کردار البتہ مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے کوئی مرد دکھایا نہیں جا سکتا تھا۔ طوطاً وکرہاً پرنسپل نے حکم صادر کیا کہ بشیرا کو رانی سہانڑی کے روپ میں پیش کیا جائے۔ بشیرا شترغمزے کرنے لگا یہ شرط بھی عائد کی کہ جوان ماں بنے گا کیونکہ راجاؤں کی مائیں نوخیز ہوا کرتی ہیں۔ اپنا معاوضہ فی دن کے حساب سے اس نے طے کیا۔ جس میں رکشا کا کرایہ بھی شامل تھا۔ جرگہ ہال ہمارے لئے بک کر دیا گیا۔ باقی کردار بھی بڑے بد باطن نکلے۔ سارے اداکار دیہاڑی دار مزدوروں کی طرح ہر رات نقد معاوضہ وصول کرتے۔ کہیں بھی ریہرسل کا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ ان کم بختوں کو یقین ہی نہ آتا کہ ڈرامے کے بعد انہیں واقعی معاوضہ دیا جائے گا۔ انہیں یقین تھا کہ ہم ان کے پیسے داب لیں گے۔ چائے سگریٹ کا خرچ الگ سے مانگتے تکلیف دہ پہلو یہ بھی تھا کہ سٹیج کے بغلی کمروں کی بجائے وہ گھر سے ہی گیٹ اپ میں آیا کرتے۔ ادھر راجہ داہر کے جرنیل عسکری لباس تن زیب کیے ڈھال کمر پہ لگائے۔ خود سر پہ سجائے، کمر سے بندھی شمشیر جھلاتے سیوی کے بازاروں میں مٹر گشت کرتے ڈرامہ گاہ آتے۔

ادھر محمد بن قاسم کے جرنیل تزک واحتشام سے مجاہدینِ اسلام کے روپ میں نکلتے۔ کوئی ریڑھی سے شربت پیتا تو کوئی سگریٹ سلگانے کیلئے ماچس مانگتا۔ دونوں گروہوں کی واپسی بھی اسی شان سے ہوتی۔ چند بار پولیس نے القاعدہ کے چھاپہ مار سمجھ کے انہیں دھر لیا۔ ایسے میں پرنسپل کا موٹر سائیکل بڑا کام آتا۔ بھاگم بھاگ ہم

انہیں چھڑا لایا کرتے۔

ایک بار اینٹی ٹیرریسٹ پولیس نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ سبھی کو باندھ لے گئے۔ بڑی ہی مشکل سے انہیں نجات دلوائی۔ چند جذباتی پولیس والوں نے حلیے کی وجہ سے انہیں یزید کا ساتھی قرار دیتے ہوئے ان کی مشکیں کس دیں اور حوالات میں بند کر دیا۔ نہ تو اداکار ہمارے قابو میں آتے نہ ہی پولیس ہماری بات سمجھتی۔ جس روز راجہ داہر گرفتار ہوا پرنسپل خود تھانے پہنچ گیا۔ ''اس کی تلوار لکڑی کی ہے' اس کی ڈھال موٹے گتے کی ہے۔ بھلا یہ القاعدہ کا دہشت گرد ہو سکتا ہے۔'' پرنسپل وکیلوں کی مانند جرح کرنے لگا۔

پولیس اپنی کارکردگی دکھانا چاہتی تھی۔ ''طالبان تو ہو سکتا ہے۔''

''طالبان کیسے؟ وہ تو مسلمان ہیں' یہ تو ہندو ہے' بلکہ ہندوؤں کا راجہ ہے۔ راجہ داہر۔''

راجہ داہر آزاد ہوتے ہی پرنسپل پہ برس پڑا تھا بڑا احسان فراموش۔ ''میں نہیں کرتا اداکاری' روز ہی پولیس پکڑ لیتی ہے' کل میری رات بیوی بھی چھری لیے آس پاس منڈلاتی پھری۔ شوق جہاد میں کوئی مجھے مار ہی ڈالے گا۔ مجھے موبائل پہ دھمکیوں والے پیغام بھی مل رہے ہیں کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ مار ہی ڈالیں گے۔''

پرنسپل بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''تم سے تو محمد بن قاسم بہادر ہے' تم نے ہندو راجاؤں کی دلیری کی بھی لاج نہ رکھی' خود ہی پولیس سے جان چھڑا کر آ جاتے۔ محمد بن قاسم اور ساتھیوں کو پولیس نے یزید کا ساتھی قرار دے کر حراست میں لے لیا تھا۔ خود ہی رہا ہو کر چنگی رکشہ دوڑاتا واپس آ گیا تھا۔ دل چاہتا ہے اسی لکڑی کی تلوار سے تمہارا سر اتار دوں۔''

نہ پولیس ہمارا مسئلہ سمجھتی نہ ہی اداکار اپنی روش بدلتے۔ چونکہ رانی سہانڑی کا کردار مختصر تھا۔ اسے آخری دنوں میں انٹری دینا تھی۔ بشیرا منجھا ہوا اداکار تھا۔ سٹیج کا بادشاہ تھا۔ اس کے مختصر سے مکالمے تھے بخوبی ادا کر لیتا۔ اسے بلوایا تو اس نے محمد قاسم سے بھی زیادہ معاوضہ مانگا۔ اس کے پاس جوان عورت کے لباس اور گیٹ اپ تھا۔ بوڑھی عورت بننے کیلئے وہ تیار نہ ہوا۔

''میری مارکیٹ گر جائے گی' یوں بھی راجاؤں کی مائیں جوان ہوا کرتی ہیں۔ رائے سیوا کی رانی بوڑھی کیسی ہو سکتی ہے؟ میرا وگ وغیرہ بھی کالا ہے۔ ایک ڈرامے کے لئے اپنا وگ سفید رنگ کر کے خراب نہیں کر سکتا۔''

معاوضہ سن کر پرنسپل کی سٹی گم ہو گئی۔ ''تم کوئی اصل رانی تو ہو نہیں تیس ہزار' بیس ہزار دوں گا۔ تم رانی مکھر جی بھی نہیں۔''

بارے بیس ہزار معاوضہ طے پایا۔ دس ہزار پیشگی ادا کیا گیا۔ اگلے روز ہال کے باہر رکشہ رکا تو دیکھا بصرے کی قاتل حسینہ رانی سہانڑی کے روپ میں مٹکتی ہوئی چلی آ رہی ہے' یوں مارتی کاٹتی چلی آ رہی تھی جیسے ترکوں کی فوج۔ کئی ایک تو دل تھام کے رہ گئے' چمکتا دمکتا لباس' ناگن نما زلفوں والی اصلی جاپانی وگ' نقلی زیوروں سے لدی پھندی ہر قدم پہ زلزلہ' ہر ادا سے جسم میں ارتعاش، ماتھے پہ بجلیاں مارتی بندیا۔ جو کسی بیوہ کو نہیں لگانی چاہیے تھی۔ چونکہ میں ڈرامے کا ڈائریکٹر تھا' اس سے پوچھا کہ یہ سینے میں ارتعاش کیسا؟ بیک گراؤنڈ تو خیر پہلے ہی سیمابی سا ہے۔ بشیرا نے راز کھولا کہ غباروں میں ہوا اور تھوڑا پانی بھر کے سینے پہ باندھنے سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

میری تشویش حقیقی تھی۔ ''اگر ایک غبارہ پھٹ گیا تو کیا ہو گا۔''

بشیرا نے یقین دلایا کہ بڑھیا غبارے ہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ بار ہا دہ ایسے

مناظر اور کردار پیش کر چکا ہے۔ ہمارا ڈرامہ لائبریری فنڈ اور دیگر کئی فنڈ کھا چکا تھا' ایک لاکھ کی بجائے بجٹ ڈھائی لاکھ پہ پہنچ چکا تھا۔ جرنیل بڑے لالچی اور ندیدے ہوا کرتے ہیں چاہے داہر کے ہوں یا محمد بن قاسم کے چائے طلب کرتے' رات کو بریانی کی پلیٹیں صاف کر جاتے۔ رانی سہانڑی نے الگ سے تباہی مچادی۔ کہاں تو ریہرسل دیکھنے والوں کو ہم خود مشکلوں سے لایا کرتے تھے کہاں ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی۔ بہت سے دل پھینک راجہ داہر کی ماں کے ساتھ تصویر بنواتے تحفے دیتے۔ عشاق کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک بار رات گئے محمد بن قاسم کو بمعہ مجاہدین اسلام سپاہی باندھ کے لے گئے کہ جہاز اغواء کرنے کا ارادہ تھا۔ پرنسپل کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ وہ ڈی ایس پی پر برس پڑا۔ ''سیوی میں ہوائی اڈہ نہیں' جہاز کہاں سے اغواء کریں گے یہ؟ کوئی تانگہ یا گدھا گاڑی اغوا کرنے کا کہتے تو میں یقین بھی کر لیتا تو تم مجھے خاران لگوا کے ہی دم لو گے۔''

ایک شام خبر آئی کہ راجہ داہر اس کی ماں اور ہندو سپاہیوں کو بھارتی جاسوس قرار دے کر حراست میں لے لیا گیا۔ ہماری زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ رات گئے ڈی آئی جی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے پولیس کی سرزنش کی کہ وہ اداکاروں سے لاتعلق ہی رہیں۔

تھانے میں ہم نے الگ سے بحث کی کہ ہمارے ہاں تو نواب اور سردار ہیں۔ راجے بالکل نہیں رہے اور جو نام کے راجہ ہیں۔ ڈومیسائل سٹیفکیٹ پر بلوچستان میں سرکاری نوکریاں کر رہے ہیں۔ نہایت غیر خطرناک ہیں اور یہ تو اداکارہ ہے' ورنہ تو راجہ داہر کو فوت ہوئے سینکڑوں برس بیت چکے ہیں۔ نیام سے تلوار نکال کر پیش کی خالص لکڑی کی ہے۔ ہمارے آنے سے پیشتر پولیس والوں نے انہیں دعوتِ اسلام

دے ڈالی۔ بلکہ گشت پہ نکلی ہوئی تبلیغی جماعت نے انہیں گھیر کر جنت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ راجہ داہر کی ماں جو مسلمان تو تھی ہی۔ دوبارہ مسلمان ہونے کیلئے تیار ہوگئی۔ اس نے اپنا ارادہ بھی لکھوا دیا کہ ڈرامے کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ تین دن کیلئے اللہ کی راہ میں نکلے گی۔ یعنی نکلے گا۔

ادھر محمد بن قاسم گھر سے اپنے سپاہیوں کے ہمراہ نکلتا تو دکاندار اور لوگ باگ اسلام زندہ باد کے نعرے لگاتے۔ بعض سنجیدہ حضرات راہ روک کے پوچھتے کہ وہ کب راجہ داہر کو واصل جہنم کرے گا۔ یہ دیکھ کر راجہ داہر نے ڈرامہ کرنے سے پھر انکار کر دیا۔ ہم اس پہ اتنی محنت کر چکے تھے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ کمبخت ایسا کائیاں نکلا کہ اس نے اپنا اور اپنے جرنیلوں کا معاوضہ بڑھا دیا۔ ان ہی دنوں شومئ تقدیر سے بابری مسجد کا قضیہ چل نکلا بعض جذباتی مسلمانوں نے راجہ داہر اور اس کے سپاہیوں کی پٹائی لگانے کا منصوبہ بنایا۔ شکر ہے کہ راجہ داہر کی ماں نے بروقت مطلع کر دیا۔ بلوائی اسے مرد ہی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ وہ اسے سازش میں شریک کرنے گئے تھے ''بشیر بھائی تم بھی جنت کما لو ستر حوریں ملیں گی راجہ داہر کو مار ڈالو''۔ ہم نے انتظام کیا کہ چار سپاہی راجہ داہر اور اس کے سپاہیوں کو حفاظت سے ہال میں لایا کریں گے۔ اور رات کو بحفاظت گھر چھوڑ آئیں گے۔ رانی سہانڑی کو میں خود چھوڑنے جایا کرتا۔

ڈراموں میں صرف ایک (Prompter) ہوا کرتا ہے۔ مگر اپنے اداکاروں کی نالائقی کے سبب چار Prompter رکھے۔ جو رجسٹر کھولے کرداروں کو ان کے ڈائیلاگ یاد دلایا کرتے۔ ہر ایک کے حصے میں ایک کردار آتا۔ ہم سب کی جان سولی پہ ٹنگی تھی کہ سیوی کا میلہ شروع ہوگیا۔ پرنسپل روز شکایت کرتا کہ وہ برے برے خواب دیکھ رہا ہے۔ کبھی اسے خاران میں پرنسپل لگایا جا رہا ہے کہیں پنجگور کالج کا چارج لے

رہا ہے۔ کبھی دیکھتا کہ دالبندین کالج میں پرنسپل کی کرسی پہ براجمان ہے۔ لاحول پڑھ کر کروٹ بدل کر سویا کرتا۔ مگر ڈراؤنے خواب بھوتوں کی مانند اسے گھیرے رہتے۔ جس کا غصہ وہ مجھ پہ نکالتا۔

بارے ہماری باری آئی۔ سیکورٹی چیک کے بعد ہال ہمارے حوالے کر دیا گیا۔ اسلامیات کے پروفیسر تسبیح لے کر ہمارے ڈرامے کی کامیابی کیلئے ورد کرنے لگے۔ حالانکہ وہ ڈرامے کے سخت خلاف تھے مگر اب تو کالج کی شہرت اور عزت کا سوال تھا۔ ہال میں گنجائش سے کہیں زیادہ تماشائی سما گئے۔ وی آئی پیز کے جھرمٹ میں وزیر موصوف تشریف لائے اور عین درمیان میں بالکل سٹیج کے سامنے مہمان خصوصی کی کرسی پہ جلوہ افروز ہو گئے۔

ہال کی روشنیاں گل کر کے صرف سٹیج کی روشنیاں جلائی گئیں۔ سٹیج کے مائیک آن کر دیئے گئے میں نے اداکاروں کے آگے ہاتھ جوڑے۔ کہ خدارا مکالمے یاد رکھنا۔ کہیں بھولے تو اپنے Prompter کی آواز پہ کان لگانا۔

ہمارے دل دھڑک رہے تھے' ادھر پردہ اٹھا ادھر پرنسپل کے خفیہ اشارے پہ کیمسٹری کے پروفیسر نے اپنے طلباء کو حملہ عام کا حکم دیا۔ کرسیوں اور نشستوں کے نیچے چھپے ہوئے لافنگ گیس کے سیلنڈروں سے غیر محسوس طور پہ گیس کا اخراج کر دیا گیا۔ سٹیج پہ چاکر رند کے قلعہ کا اندرونی منظر بنا ہوا تھا۔ راجہ داہر تخت پہ جلوہ افروز تھا۔ تخت کے پیچھے پانچ مسلح جرنیل مستعد کھڑے تھے۔ ایک خادم اتنی سردی میں پنکھا جھل رہا تھا۔ راجہ داہر کی کلائی پہ راڈو گھڑی بندھی تھی جو وہ اتارنا بھول گیا تھا۔ یہ دیکھ کر قہقہے بلند ہوئے پرنسپل کی جان میں جان آئی۔ اتنے میں چوبدار سٹیج پر نمودار ہوا۔ کورنش بجالایا اور خادمانہ انداز میں بولنے کی بجائے گرجا۔ '' عالی جاہ! باہر آپ کو ایک آدمی

بلاتا ہے۔'' راجہ داہر ذرا حیران ہوا' لیکن سنبھل کر بولا '' فریادی کو حاضر کیا جائے۔''

محمد بن قاسم جرنیلوں کے ہمراہ راجہ داہر کے سامنے آیا بولا '' السلام وعلیکم '' پھر سنبھل کے توقف کیا اور مکالمہ یوں بولا '' السلام علیکم ورحمتہ اللہ یا راجہ داہر '' سلام مکالمے کا حصہ نہ تھا۔ داہر حیران ہوا کہ واعلیکم السلام کیونکر کہے۔ وہ تو ہندو ہے لہٰذا خاموش ہی رہا مگر خاصہ بدحواس ہو گیا۔ Prompter اپنے مائیک پہ چلایا '' سبحان اللہ! کیا دور تھا کہ سیوی میں کوئی سلام کا جواب دینے والا نہ تھا'' اس نے داہر کا مکالمہ دہرایا '' ہمارے حضور گستاخی کا سبب؟ کیا چاہتے ہو۔''

داہر نے بعینہ مکالمہ دہرایا تو محمد بن قاسم نے للکارا '' دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یا تلوار سے مقابلہ کرو۔''

اتنے میں محمد بن قاسم کی جیب میں پڑا موبائل پوری شدومد سے بجنے لگا۔ اس نے گھبرا کر موبائل نکالا' آف کیا اور دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ تماشائی جو پیٹ پکڑے ہنسی سے بے حال ہو رہے تھے ہنستے ہنستے فلک شگاف قہقہے لگانے لگے۔

محمد بن قاسم آگے بڑھا '' میں اسلام پیش کرتا ہوں۔'' داہر اتنا بڑا Audience دیکھ کر مکالمے بھول رہا تھا۔ '' مجھے کچھ پیش نہ کرو میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔''

Prompter چلایا '' میں اسلام قبول نہیں کروں گا'' داہر کو مکالمہ یاد آ گیا' اس نے مکالمہ دہرایا۔ اچانک داہر کی ماں عقب سے نمودار ہوئی۔ '' بیٹا مسلمانوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام قبول کر لو بیٹا'' ساتھ ہی وہ الاپنے لگی '' اسلام کا بول بالا' جھوٹے کا منہ کالا۔''

داہر گرجا۔ '' میں مقابلہ کروں گا ماتا تم پردے کے پیچھے بینچ پہ بیٹھو۔ میں ان کو نہیں

چھوڑوں گا۔'' مکالمے کے مطابق محمد بن قاسم نے نعرہ تکبیر بلند کرنا تھا جس کا ساتھ اس اس کے جرنیلوں نے دینا تھا۔ مگر عالم بدحواسی میں راجہ داہر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور تلوار کے دستہ پہ ہاتھ ڈالا۔ محمد بن قاسم کی جانب بڑھا ''نعرہ تکبیر۔ نعرہ تکبیر'' وہ چلانے لگا۔ محمد بن قاسم سراسیمہ ہوگیا۔ محمد بن قاسم کے جرنیل مکالمے کے مطابق چلائے ''اللہ اکبر'' راجہ داہر نے چاہا کہ تلوار سونت لے ادھر یہ ہوا کہ مسلسل پریکٹس سے تلوار کمزور پڑ چکی تھی' تلوار تو باہر نہ نکلی دستہ ہاتھ میں آ گیا۔ اب وہ دستہ Hilt سونتے محمد بن قاسم کی جانب بڑھا۔ محمد بن قاسم حیران ہوا کہ وہ اب کیا کرے۔ داہر نے عالم پریشانی میں میری جانب دیکھا۔ میں نے اشارہ کیا کہ دستہ تو جڑنے سے رہا۔ نیام سے لڑو۔ اسی تگ ودو میں داہر کی نقلی مونچھیں تیز پنکھوں کی وجہ سے اڑ کر سیکرٹری ایجوکیشن کی گود میں جا گریں۔ پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ راجہ داہر کی کلائی پہ راڈو گھڑی بہار دکھا رہی تھی' مونچھیں اُڑ چکی تھیں اور وہ تلوار کا Hilt لئے کھڑا تھا۔ اس کا اپنا Prompter مکالمہ داہر نے کی بجائے فی البدیہہ شاعری کرنے لگا'' کافر ہو تو نیام سے بھی لڑتا ہے سپاہی۔ لڑتا ہے لڑتا ہے۔'' داہر سمجھ گیا اور اس نے نیام سونت کر محمد بن قاسم پر حملہ کردیا۔ ڈرامے کا یہ حصہ خاصہ جذباتی تھا کہ راجہ داہر اور اس کے سپاہی مسلمانوں سے لڑتے مارے جائیں گے۔ انہیں تلواریں گھونپی جائیں گی تو چیختے کراہتے گر کے مرتے جائیں گے۔ چونکہ ہال میں ان کے عزیز و اقارب اور دوست بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنا سین ختم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے مارے جائیں۔ بار بار محمد بن قاسم کے جرنیل تلواریں گھونپتے مگر وہ نہ مرتے۔ بلکہ اپنی تلواروں سے الٹا انہی کو دھن کے رکھ دیتے۔ ان کی تلواریں ٹوٹ گئیں گتے کے خود پھٹ گئے وہ ٹوٹی ہوئی تلواروں اور نیاموں سے لڑتے چلے

گئے۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کے پیٹ میں بار ہا ٹوٹی ہوئی تلوار گھونپی لیکن داہر باز نہ آیا جواباً اس نے نیام سے خوب ٹھکائی کی۔ غصے میں آ کر سر پہ یوں نیام کا وار کیا کہ محمد بن قاسم بلبلا اٹھا۔ اس کا بیٹا یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی غیرت جاگ اٹھی اس سے پہلے کہ کوئی اس بچے کو پکڑ پاتا۔ وہ شیر کی طرح بڑھا سٹیج پہ جا چڑھا اور راجہ داہر کی ٹانگ میں دانت گاڑ دیئے۔ دونوں طرف کے جرنیل اپنا لڑنا بھول کر بچے کو قابو میں لانے لگے۔

بڑی مشکل سے بچے کو سٹیج سے اتارا گیا۔ اسی کھینچا تانی میں محمد بن قاسم کی نقلی داڑھی کچھ پسینے اور کچھ پنکھوں کی ہوا کے سبب اڑ گئی اور لہراتی ہوئی وزیر تعلیم کی گود میں لینڈ کر گئی۔ وزیر مارے ہنسی کے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ اس نے قہقہے لگاتے ہوئے داڑھی اٹھا کر محمد بن قاسم کو پیش کی۔ جس نے دوبارہ چہرے پہ تھوپ لی۔ چونکہ سٹیج پر کفر واسلام کی جنگ پوری شد و مد سے جاری تھی۔ ہم نے پردہ گرا دیا راجہ داہر اور اس کے جرنیلوں کو زبردستی سٹیج پہ لٹا دیا کہ مردہ بن کے پڑے رہیں ورنہ باقی رقم سے محروم رہیں گے صورتحال قابو میں آئی تو ہم نے پردہ اٹھوا دیا۔ راجہ داہر کے ساتھی مرے پڑے تھے۔ مرنے سے پہلے داہر نے مونچھیں لگا لی تھیں۔ محمد بن قاسم نے بھی اپنی داڑھی ٹھیک کر لی تھی۔ داہر کی راڈو گھڑی کلائی سے اتار لی گئی تھی Prompter ڈرامہ آگے چلانے لگا۔

''کفر اور اسلام کی جنگ میں جیت ہمیشہ اسلام کی ہوتی ہے۔ داہر کی ماتا شاید جانتی ہی تھی''۔

بجلیاں گراتا بشیرا یعنی راجہ داہر کی ماں سٹیج پہ نمودار ہوئی۔ اس کی اداکاری کمال کی تھی' فرط غم سے جھکا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو' کپکپاتی آواز میں فریاد کی۔'' داہر

میرے بیٹے'' ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی۔'' یہ کیا کیا بیٹا'' وہ اپنا سر پیٹنے لگی۔ اچانک وہ اپنا گیٹ اپ بھول گئی اگرچہ یہ اداکاری کا حصہ نہ تھا مگر منظر میں حقیقت نگاری بھرنے کیلئے ڈائریکشن کے برعکس اس نے بین کرتے ہوئے سینے پر دو ہتھڑ مارے۔ جس سے دونوں غبارے یکے بعد دیگرے دھماکے سے پھٹ گئے۔

پورا ہال ہی بے قابو ہوگیا۔ یوں لگتا تھا ہال کی چھت ہی اُڑ جائے گی۔ داہر اور اس کے آنجہانی جرنیلوں نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں' رانی سہانڑی کا حلیہ دیکھ کر قہقہوں میں شامل ہوگئے۔ راجہ داہر کی لاش کچھ دیر تو ہنسی روکنے کی کوشش میں کانپتی رہی۔ پھر تگ و دو دھرے کی دھری رہ گئی۔ داہر کی لاش اٹھ بیٹھی اور پیٹ پکڑ کر قہقہے لگانے لگی۔ داہر کی لاش کو قہقہے لگاتے دیکھ کر وزیر موصوف ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ اور زانو پیٹنے لگے ہمیں ڈر پیدا ہوا کہ فوت ہی نہ ہوجائیں۔ کیونکہ غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ ہم نے جلدی سے پردہ گرادیا۔ ڈاکٹر دوڑے وزیر کو لخلخہ سنگھانے۔ پرنسپل نے سیکرٹری کو گھیر لیا۔'' اب تو میں سیوی میں ہی رہوں گا ناں؟'' سیکرٹری کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے' وہ اب تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ اس نے پیٹ پکڑے پکڑے اثبات میں سر ہلایا۔ پرنسپل بے تاب ہو رہا تھا۔'' کب تک رہوں گا۔'' سیکرٹری نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ "Till your retirement or death which ever is earlier."

1۔ چنگش تول: زندہ مینڈکوں کو ترازو میں تولنا۔
2۔ اردھانگنی: مرد اور عورت کو ایک مانا جاتا ہے۔ شیوا اور پاربتی کو ایک بت میں یوں دکھایا گیا ہے کہ آدھا شیوا اور آدھا پاربتی کا حصہ۔ جیسے یونان میں انیڈروجنی
3۔ سیوی گوڑی گرداں بات: سیوی جنگی رسالوں کی ٹاپوں تلے رہے۔

قراقلی

دادا غلام انگریز بہادر کے ہاں خانساماں تھا۔ مزے مزے کے کھانے بنایا کرتا۔ اکثر انگریز ڈنر کے بعد بخشیش بھی دیا کرتے۔ ایک ایسے ہی ڈنر میں دادا غلام کو محفل میں طلب کیا گیا۔ مہمانوں پہ کچھ تو مے نوشی کا رنگ تھا اور کچھ لذیذ کھانوں کا اثر۔ صاحب بہادر نے نشے کی ترنگ میں پوچھا'' مانگ کیا مانگتا ہے۔'' غلام نے ہاتھ جوڑے نگاہیں قالین پہ گاڑے بولا!'' مجھے نوابی عطا کیجئے۔ نواب بنادیجئے۔'' مہمان تھوڑی بہت اردو سمجھتے تھے۔ ایک قہقہہ پڑا۔ اسی روز ایک نواب نے ہی بڑھیا قراقلی پیٹر ڈگلس پولیٹیکل ایجنٹ کو تحفتہً پیش کی تھی۔ پیٹر کو جانے کیا سوجھی کہ وہیں محفل میں منگوالی۔ سنہری مائیل گھنگھریالے پشم سے بنی قراقلی چمک دمک رہی تھی۔ اس نرم چمڑے کی ماہرانہ سلائی گویا سونے پہ سہاگہ۔ حکم دیا کہ دادا کی تاج پوشی کی جائے۔ قراقلی غلام کے سر پر سجی تو تالیاں بج اٹھیں۔ قراقلی دادا غلام کی شخصیت کو نیا روپ دے رہی تھی۔ دادا غلام کو یقین تھا انگریز حاکم زبان کے دھنی ہیں۔ جو وعدہ کریں پورا کر کے ہی رہتے ہیں۔ پیٹر نے اعلان کیا'' فی الحال یہ نوابوں والی ٹوپی پہنو تمہیں

نواب بھی بنا دیں گے۔ آج سے اسے نواب غلام کہا جائے۔''

غلام دن بھر سر پہ قراقلی سجائے رکھتا۔ روزمرہ کے فرائض میں دشواری پیش آتی۔ یہ خدشہ بھی رہتا کہ ہنڈیا میں ہی نہ گر پڑے۔ مگر یہ تو نوابی کی ابتداء تھی۔ مسلسل قراقلی پہننے سے سر بوجھل سا رہنے لگا۔ آنکھیں بھی اس نارواء بوجھ سے دھندھلائی سی رہتیں۔ بال بھی تیزی سے گرتے چلے گئے۔ بالوں سے فارغ ہو کر بھی فارغ البالی نہ آئی۔ نہ ہی نوابی ملی۔

پیٹر یوں تو ہر مسلمان کو غلام اور ہندو کو داس کہا کرتا ''سبھی کے نام کے ساتھ غلام یا داس جڑا ہوا ہے دنیا بھر میں جبراً غلام بنائے جاتے ہیں۔ تم سب تو رضا کار غلام ہو سبھی کے نام کے ساتھ غلام اور داس کا سابقہ یا لاحقہ ہے ہندو ہو تو داس۔ مسلمان بنے تو غلام۔ واہ رے داسو اور غلامو۔'' مگر دادا کو وہ نواب ہی بلایا کرتا۔ دو ایک برس میں غلام کے بال جھڑ گئے۔ چندیا چندا ماموں کی طرح چمکنے لگی۔ بس قراقلی کے آس پاس بالوں کی جھالر رہ گئی۔ انہی دنوں انگریز واپس جانے لگے۔ ڈھول تاشے بجا بجا کر انہیں رخصت کیا جانے لگا۔ دادا کو نوابی ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پیٹر انگلینڈ جانے لگا تو دادا دھاڑیں مارتا اپنے مربی کے قدموں پہ جا گرا۔ پیٹر نے تسلی و تشفی دی۔ ''نواب تم فکر نہ کرو ہم لوٹ آئیں گے۔ دنیا بھر میں جوتے مار مار کے غلام بنائے جاتے ہیں۔ تم سب تو رضا کار غلام ہو ریڈی میڈ غلام۔ تم گائے کو ماں اور اونٹ کو ابا کہتے ہو۔ ماسوا گدھوں اور خچروں کے تم لوگوں پہ ہر قوم نے حکومت کی ہے۔ حتیٰ کہ خاندانِ غلاماں نے تم پر حکومت کی جو کہ غلام تھے۔''

دادا کو صاحب بہادر کی بات پہ یقین آ گیا۔ لہٰذا وہ حسب سابق سر پہ قراقلی سجائے رہا۔ برسہا برس انگریز اور انگریزی حکومت کی راہ دیکھتا راہی عدم ہوا۔ دم آخر

بیٹے کے سر پہ قراقلی سجا دی کہ آقا کا عطیہ زیب سر رکھنا۔ انشا اللہ نوابی مل جائے گی دادا کے بعد بیٹے نے انتظار کیا۔

جانے کتنے برس انتظار میں بیت گئے۔ بیٹے نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے کمسن بھائی کو قراقلی پہنائی اور انگریزوں کی طرح ہی دنیا سے غائب ہو گیا۔ قراقلی پہنے سلیم بھی بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ وقت کا طوفان قراقلی پہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ کسی فلمی اداکارہ کی طرح کی قراقلی اس قدر استعمال ہونے کے باوجود بالکل نئی نویلی دکھائی دیتی۔ سلیم کا ارادہ تھا کہ مرنے سے قبل اپنے بھتیجے تغلق کو قراقلی دیتا جائے۔ شاید اسے ہی نوابی مل جائے۔ تغلق بڑا چلبلا سا' سیمابی طبیعت کا مالک تھا ایک پل نچلا نہ بیٹھتا۔ سلیم پرچون کی دکان چلاتا تھا۔ دوپہر میں اسکول سے لوٹنے کے بعد تغلق بھی ہاتھ بٹانے چلا آیا کرتا۔ سودا سلف باندھ کر گاہکوں کو دیا کرتا۔ ایک حسین لڑکی اماں کے ساتھ خورد نوش کا سامان خریدنے آئی تو تغلق نے اپنا دل بھی ترازو میں تولے بنا یاسمین کو دے دیا عشق یہاں تک بڑھا کہ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگا۔ کبھی اسے چاند میں یاسمین کا چہرہ دکھائی دینے لگتا تو کبھی سودے کی رقم ہی لینا بھول جاتا۔ سلیم کو تشویش بہ قدر وحشت ہونے لگی تو یاسمین کو بہو بنا کے گھر لے آیا۔ اسے شوق تھا کہ تغلق سرکاری افسر بنے ''سیاں بھئے کوتوال ڈر کا ہے'' الاپتے ہوئے سلیم ٹھاٹھ سے کاروبار چلائے۔ بازار میں بھی رعب داب ہو۔

مگر تغلق سرکاری افسر بننے پہ رضامند نہ تھا ''وہ کھانے غرانے کے دن گئے چچا۔ اب صحافیوں کا دور ہے۔ اچھے اچھوں کا دم نکلتا ہے ان کے سامنے۔'' بی اے کے بعد تغلق اخباری رپورٹر بن گیا۔ دن رات محنت کرتا رہا۔ جس سے شہرت اور ناموری بھی حاصل ہوتی چلی گئی۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اللہ ہر سال ایک بچہ دے دیا

کرتا۔سرکار دربار سے روابط بڑھے۔حاکموں سے میل ملاپ ہوا اقتدار کے ایوانوں میں رسائی حاصل کرلی۔ایک روز چچا سلیم کیلئے نیا شناختی کارڈ بنالایا۔جس میں چچا کی عمر تیس برس زائد درج تھی۔غربت اور تنگدستی سے چچا وقت سے پہلے پہلے ہی بوڑھا ہو رہا تھا بیوی کی موت کا صدمہ بھی اسے نڈھال کر چکا تھا۔کہنے کو تو جگت چچا تھا۔مگر تیس برس عمر کا اضافہ تو سنبھالے نہ سنبھلتا۔چچا نے سر پیٹ لیا۔''ابے اسی لئے تو میں تجھے اصل نام سے پکارنے کی بجائے تغلق کہہ کر بلاتا ہوں۔تو بادشاہ محمد تغلق کی طرح بچپن سے ہی الٹے سیدھے منصوبے بنایا کرتا ہے شیخ چلی کے پتر یہ تو نے کیا کر ڈالا۔ مجھے کیا قبر میں اتارنا چاہتا ہے۔''

تغلق تڑاک سے بولا۔''چچا اس بار یوم آزادی پہ تمہیں بانی پاکستان کا جاں نثار یعنی تحریک پاکستان کا ہیرو بنا کر پیش کروں گا تمہاری قراقلی چل جائے گی۔اس قدر ثبوت کافی ہے۔''

چچا سودا تولنے میں تو ڈنڈی مار جایا کرتا مگر ایسی کھلم کھلا دھاندلی سے اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

''میں تو نواب بننا چاہتا ہوں محمد تغلق نے اپنے چچا کا صفایا کیا تھا تو مجھے جیل بھجوانے کے اسباب کر رہا ہے۔مجھے مسلم لیگی کچا چبا جائیں گے۔تجھے یہ خیال آیا کیسے کمبخت مارے۔''

تغلق اعتماد سے بولا۔''فلم الہ دین دیکھ کر۔سامری جادوگر نے جعلی چچا بن کر الہ دین سے جادو چراغ حاصل کیا۔میں نے سوچا میں اپنے اصلی چچا سے جادوئی چراغ کیوں نہ حاصل کروں۔''چچا کو اچنبھا ہوا''میرے پاس جادو کا چراغ کہاں؟'' تغلق چچا کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوا۔''جادوئی چراغ تمہارے سر پہ سجا ہے

یعنی انگریز بہادر کی قراقلی۔سارا شہر تمہیں اس کی نسبت سے پہچانتا ہے۔جیسے زمین گول ہونے کا ثبوت ہے کہ دور سے بحری جہاز کا مستول پہلے دکھائی دیتا ہے۔تمہاری قراقلی تم سے پہلے دکھائی دیتی ہے۔تمہیں یہی قراقلی ہیرو بنادے گی۔نواب بننے کا خیال دل سے نکال دو۔نواب متروک ہو چکے ہیں پانچ روپے کے نوٹ کی مانند!اب دور ہے ہیروز کا۔''تغلق نے چچا کو طوطے کی طرح سبق رٹایا۔بہت سی باتیں یاد کرائیں یوم آزادی پہ چچا کی تصویریں چھپیں۔انٹرویو بھی آیا۔اس نے بتایا کہ قراقلی بابائے قوم نے اسے پہنائی تھی۔پولیس کے لاٹھی چارج کے سامنے وہ سد سکندری بن گیا تھا پھر کیا تھا بابائے قوم نے ضبط وتحمل کی داد دی۔اور قراقلی سے سرفراز فرمایا۔ صحافی کوئی آڑا ترچھا سوال کرتے تو چچا کنی کترا جاتا۔''عمر کے ساتھ یادداشت کمزور پڑ چکی ہے' مجھے یاد نہیں۔''یہ بھی پوچھا گیا کہ وہ آخر اتنے برس منقار زیر پر کیوں رہا'' کیونکہ میں قوم کیلئے کچھ نہ کر سکا۔ندامت سے خاموش رہا۔یوں بھی مجھے گمنامی قبول ہے۔''

چار وانگ چچا کی شہرت پھیل گئی بھانت بھانت کی مسلم لیگیں اسے عہدے پیش کرنے لگیں۔چچا مسلم لیگیوں کے جلسوں کی رونقیں بڑھانے لگا۔چچا کو اسکولوں میں بھی بلایا جانے لگا۔وزیراعلیٰ نے چائے پہ بلایا ایک پلاٹ بھی عطا فرمایا۔گورنر کو اپنی حب الوطنی پہ آنچ آتی محسوس ہوئی تو ترت بلوا کر ایک سرکاری بنگلہ الاٹ کر دیا۔ تاحیات ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کردیا۔سیاسی دکان چل نکلی تو اپنی دکان بڑھا دی۔سچے مسلمان کی طرح حج اور شادی کا شوق دل میں کروٹیں لینے لگا۔حج تو سرکاری کھاتے میں کرادیا گیا۔مگر سرکاری شادی کا قانون پاکستان میں اب تک بنا نہیں۔حرف مدعا زبان پہ لایا تو تغلق کا ماتھا ٹھنکا۔چچا کا واحد وارث وہی تھا۔کل کلاں اولاد ہوگئی تو

سب کچھ وہ بچہ اینٹھ لے گا۔ چچا کے وظیفے بندھے تھے۔ ہُن برس رہا تھا۔ بہت سے پلاٹ بھی مرحمت فرمائے جا چکے تھے۔ ایسی موٹی آسامی کو تغلق کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ تغلق نے چھان بین کے بعد ایک چالیس سالہ بانجھ مطلقہ سے چچا کا نکاح پڑھوا دیا۔ چچا کی سرکاری عمر نوے برس تھی یعنی دلہن کے دادا سے بھی کئی برس بڑا۔ دلہن نگہت نے آنگن میں قدم رکھا تو سہمی سہمی سی قدرے خائف تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھ کر مودب ہوگئی۔ اسے گماں تھا کہ اس کا شوہر بلا ڈنڈے کا جھنڈا ہے۔ بنا استری جھنڈے کی طرح بستر کے ایک کونے میں دبکا رہے گا۔ کبھی کبھار قومی تقاریب میں لہرانے کے کام آئے گا۔ مگر شوہر تو مردِ میدان ثابت ہوا چند ہی روز میں نگہت پر پرزے نکالنے لگی ''یہ تبدیل کردو۔ وہ تبدیل کردو۔'' سلیم طوعاً کرہاً باتیں مانتا رہا۔ نگہت کچھ زیادہ ہی مطالبے کرنے لگی ''شیروانی یا اچکن نہ پہنا کرو۔ اس میں نہ کھڑکی ہے نہ روشن دان یوں جکڑے جاتے ہو کہ کسی روز دم ہی نکل جائے گا۔ کالے کپڑے کا تابوت!!!! اور اس قراقلی کے بوجھ تلے سے نکلو ذرا وزن سر سے اترے۔ سر کو تازہ ہوا لگے تو تمہیں پتہ چلے تمہارا بھتیجا تمہارا مال اڑا رہا ہے۔''

سلیم چراغ پا ہوگیا۔ ''خبردار! زبان نہ کھولنا یہ شیروانی نہیں میری وردی ہے۔ بلکہ میری کھال ہے۔'' نگہت لڑنے پہ اتر آئی۔ ''تمہاری کھال اتار کے تمہارا مرغ مسلم بنادوں گی۔ اور قراقلی میں کیا دھرا ہے؟''

سلیم نے وکالت کی۔ ''یہ حب الوطنی کا ثبوت ہے۔''

نگہت بحث بازی پہ اتری ہوئی تھی۔ ''حب الوطنی کا جوتے پاجامے سے کیا تعلق۔ اس سے انگریز کی ہیٹ ہی بھلی۔ چھجا باہر نکلا رہتا ہے۔ دھوپ بارش میں بھی بچاؤ رہتا ہے۔''

ایک صبح جب سلیم کبڈی کے ہارے ہوئے کھلاڑی کی مانند بستر میں بظاہر مردہ سا پڑا تھا۔ نگہت نے چپکے سے قراقلی میز سے اٹھائی۔ پابرہنہ چلتی وہ دبے پاؤں چھت پہ جا نکلی اتفاقاً ایک ٹرک گزر رہا تھا۔ اس نے قراقلی ٹرک میں اچھال پھینکی سلیم جانبر ہوا تو قراقلی کیلئے اودھم مچا دیا۔

''کہاں ہے میری قراقلی؟'' وہ زخمی بھیڑیئے کی مانند غرانے لگا۔ ''میری جانے جوتی'' نگہت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ تغلق اس شور سے بدحواس ہوکر دوڑا چلا آیا۔ قراقلی کی گمشدگی سے ہراساں ہوگیا۔ ''یہ قراقلی تمہاری پہچان ہے۔ چچا اسے کھوج لو۔'' پورا کمرہ تلپٹ کر ڈالا۔ مگر قراقلی نہ ملی۔ تغلق دور کی کوڑی لایا۔ ''چچا تم کچھ روز بیمار بن کے لیٹے رہو ظاہر ہے بیمار شخص بھلا قراقلی کیوں پہنے گا۔ میں تمہاری بیماری کو بھی کیش کروں گا۔'' تغلق نے صحافیانہ تعلقات برتتے بڑی بڑی نمایاں خبریں لگا دیں۔ اپنی تصویریں چھپوانے کے شوق میں سیاستدان اور وزیر وزراء چلے آئے۔ کچھ زرِ نقد بھی دے جایا کرتے۔ چوتھے روز سیٹھ منوچہر ہوڈی والا چلا آیا۔ اس نے ایک خوبصورت پیکٹ سلیم کو پیش کیا ''حیرت ہے کہ آپ کی قراقلی میرے گودام سے ملی ہے۔ میرے کارندوں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھلا وہاں کیسے پہنچی۔'' سلیم کا دل بلیوں اچھل رہا تھا مگر جذبات پہ قابو پاتے ہوئے سرگوشی پہ اکتفاء کی ''اس میں پڑوسی ملک کا ہاتھ ہے۔ کفر اور اسلام کی جنگ تو ہمیشہ جاری رہے گی۔'' پیکٹ کھول قراقلی سر پہ سجالی۔ اس بوجھ کی ADDICTION سی ہوچکی تھی۔

''شاید قدرت کا اشارہ ہو کہ ہم پارسی بھی آپ کو اپنا لیڈر بنالیں۔'' سیٹھ نے نیازمندانہ تبصرہ کیا۔

''اللہ کے کام نرالے ہیں واہ!'' سلیم نے گرہ لگائی۔ قراقلی اب تغلق کے قبضے

میں رہا کرتی۔ بوقت ضرورت چچا سلیم کو استعمال کیلئے دے دیا کرتا۔ انہی دنوں پکنک کا پروگرام بنا تو سلیم حسب روایت قراقلی سر پہ سجائے نکلا۔ دوپہر میں قیلولہ کرتے ہوئے سلیم کی آنکھ لگ گئی۔ نگہت نے غنیمت جانتے ہوئے قراقلی گھنے درختوں پہ اچھال پھینکی۔ وہیں کہیں ٹہنیوں پہ اٹک گئی۔ پھر گھمسان کا رن پڑا۔ نگہت لاعلمی ظاہر کرتی رہی جب کہ سلیم اور تغلق اسے ہی موردالزام ٹھہرائیں۔ تغلق کے بیوی بچے البتہ اس جھگڑے میں لاتعلق رہے۔ تغلق دانت پیستا ''چچا کوئی اپنا ہی تمہیں تباہ کرنے پہ تلا ہوا ہے۔'' بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر قراقلی نہ ملی۔ تغلق پھر بستر سے آن لگا۔ علاج کیلئے رقوم آنے لگیں۔ پانچویں روز بعد پرندوں کی مارکیٹ سے فقیر اچڑی مار چلا آیا۔ دشمن کے کٹے ہوئے سر کی مانند اس نے قراقلی ایک چادر میں لپیٹ رکھی تھی۔ ''کل پرندوں کے جال لگانے درخت پہ کود پھاند رہا تھا کہ آپ کی ٹوپی ایک بلند ٹہنی پہ اٹکی ہوئی مل گئی۔ بھلا یہ وہاں کیسے پہنچی۔''

''قدرت کے کاموں میں دخل نہ دیا کرو فقیرے۔'' چچا نے نصیحت کی۔ اکیلے میں تغلق نے نگہت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''قراقلی کے خلاف تم سازشیں کر رہی ہو۔ میں چچا کو بتا دوں گا کہ تم بانجھ ہو۔ شبانہ روز محنت سے بھی ولی عہد ملنے سے رہا۔ تمہیں چلتا کرے گا۔ میں اس کی نئی شادی کر دوں گا۔'' نگہت ہاتھ نچا کر بولی ''میں نے سلیم کا پرانا اور نیا شناختی کارڈ کہیں چھپا رکھا ہے۔ غداری کے جرم میں سلیم کو پھانسی کی سزا ملے گی اور تم جیل میں چکی پیسو گے۔'' خوف سے تغلق زرد پڑ گیا۔ اسے چچا بھی غصہ آیا کہ اتنی صحت مند بیوی سنبھال لی مگر دو معمولی سے شناختی کارڈ نہ سنبھال سکا۔ صورتحال خطرناک تھی اس نے سٹک جانے میں عافیت جانی۔ اب جو گھر میں تناؤ بڑھا تو سلیم برملا نگہت کا ساتھ دینے لگا۔ قراقلی پہ بھی بزور زباں براں نگہت نے قبضہ کر لیا۔

ایک روز گھمسان کا رن پڑا تھا۔

''قراقلی میرے قبضے میں رہا کرے گی بوقت ضرورت چچا کو پہنا دیا کروں گا۔ ٹوپی میرے دادا کو انگریز نے دی تھی۔ میری ملکیت ہے۔ زیادہ بات بڑھائی تو چچا کی دوسری شادی کرا دوں گا۔''

نگہت نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''ضرور دوسری شادی کرا دینا تا کہ جیل میں تمہارے چچا کی خدمت کیلئے کوئی تو ہو۔'' ایک بار پھر تغلق کو ہتھیار پھینک کر پسپا ہونا پڑا۔ چچا پہ بھی دباؤ بڑھا رہا تھا کہ کسی طور نگہت سے دونوں شناختی کارڈ حاصل کرلے۔ اسے یہ جان کر بھی صدمہ ہوا کہ شادی محض قربت نہیں تھی بلکہ چچا بری طرح نگہت پہ لٹو ہو چکا تھا اور رفتہ رفتہ قراقلی سے بیزار ہوئے جاتا تھا۔ سلیم کو فیصلہ کرنا تھا کہ قراقلی رکھے یا نگہت۔ رقابت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ سلیم نے ایک روز قراقلی جا کر ٹرین میں رکھ دی اور خاموشی سے کھسک آیا۔ اگلے ہی دن تغلق دوڑتا ہوا چلا آیا۔ ''چچا! پولیس آ گئی ہے' گھر کو گھیرے میں لے لیا ہے نگہت نے سب پول کھول دی ہے۔'' سلیم کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایسے میں نگہت ہی حوصلہ کر کے گیٹ پہ گئی۔ انسپکٹر نے بتایا کہ چچا کی قراقلی ٹرین سے ملی ہے۔ مسافروں نے پہچان کر ریلوے پولیس کے حوالے کر دی۔ ''ہم نے سوچا چچا کے نیاز بھی حاصل کرلیں۔ من ملاقات کو ترس رہا ہے۔'' پولیس والوں کو ڈرائنگ میں بٹھایا گیا۔ چچا کی جان میں جان آئی اگرچہ چہرہ متغیر تھا۔ پولیس والوں کے جذبۂ قومی کو سراہا۔ قائد کے کچھ اقوال بھی سنائے۔ بارے پولیس والے مصافحہ معانقہ کر کے رخصت ہوئے۔ سلیم قراقلی کے خلاف بولنے لگا ''قراقلی بنانے کیلئے خاص نسل کی بھیڑوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ اس کے شکم سے بچہ پیدائش سے پہلے نکال لیا جاتا ہے۔ خمار بالوں والی اس نازک کھال سے

قراقلی بنتی ہے لہٰذا اسے مار کر کھال حاصل کی جاتی ہے۔ دو خون میں! یہ خونی ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ دو قومی نظریئے کا ٹوپی سے کیا تعلق گاندھی ٹوپی کہاں پہنتے تھے۔ امریکی صدر بھی ننگے سر پھرتا ہے۔'' تغلق نے قومی عجائب گھر سے قراقلی کا سودا کر لیا۔ سرکاری طور پر قراقلی بطور قومی یادگار محفوظ کرنے کی استدعا کی گئی۔ نمائندے بھی آئے تصویریں کھینچیں۔ قراقلی حوالے کر دی گئی۔ چچا نے ترت شیروانی بھی ان کے سپرد کر دی۔ ''یہ بھی تحریک کا حصہ ہے۔ اسے قراقلی کے نیچے ہی لٹکا دیجئے۔'' سلیم کو خیال آیا کہ قراقلی نے حقیقت میں اسے نوابی عطا کر دی۔ خانساماں سے قومی لیڈر بنا دیا۔ یوں بھی پانچ روپے کے نوٹ کی طرح نوابی اب کہاں چلتی ہے۔

اس نے نیا شناختی کارڈ بھی کتر کر کیاری میں پھینک دیا۔ اب اس کے سر پہ بوجھ نہ تھا۔ سینہ جکڑا ہوا نہ تھا۔ مکمل آزادی سے سانس لے سکتا تھا۔ مگر اگلا روز ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ نگہت نے اعلان کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چچا خوشی سے پاگل ہو گیا۔ ادھر تغلق کے چہرے پہ سرسوں پھول گئی۔ یاسمین کا بھی چہرہ اتر گیا۔ اس رات جب گھر میں شادیانے بج رہے تھے۔ نگہت نے شدت جذبات میں مطالبہ کیا کہ ''اپنی شیروانی اور قراقلی واپس لے آؤ۔ میں چاہتی ہوں میرا بیٹا روزگار کیلئے پریشان نہ ہو۔ مزے سے قومی ہیرو بن جائے۔''

ٹیڈی بے عر

سرکاری دفاتر میں بھی قبرستانوں کی طرح بیکاروں کا ہجوم رہتا ہے' نائب قاصد' کلرک' سیکورٹی گارڈز اور جانے کون کون!! جمائیاں لینے' سگریٹ پھونکنے اور کام میں التواء کی معقول تنخواہ لیتے ہیں۔ حکومت بھی ازراہِ بندہ پروری تنخواہ بڑھاتی رہتی ہے۔ البتہ ہر محکمے میں تقریباً دس فیصد سٹاف کام کرتا ہے۔ جس سے کارِ سرکار آگے ہی آگے سرکتا رہتا ہے۔ میرے سٹاف میں نمایاں نام امیر الدین کا تھا۔ وہ اسسٹنٹ سیکورٹی انچارج تھا۔ یعنی نائب قاصد سے ذرا بلند رتبہ۔ بہت ہی محنتی انسان تھا۔ اس کی خوبیوں کے پیش نظر اسے ہیرو کہا جاتا تھا۔ کہنے کو تو وہ ہیرو تھا مگر قسمت اس کی زیرو تھی۔ ''مردائی گومٹر۔ مرداں بخت تا آں مٹر (مرد سے لڑا جا سکتا ہے اس کی تقدیر سے نہیں) کرکٹ کا بلند پایہ کھلاڑی تھا' بیرون ملک جانے کی باری آئی تو سفارش اللہ خان نے کسی نالائق کو اس کی جگہ بھجوا دیا۔ یہ سفارشی ٹیم البتہ بری طرح ناکام رہی۔ شادی ہوئی تو بچی کی ولادت کے موقعہ پر بیوی چل بسی۔ ممتاز محل بیالیس برس کی عمر میں درجن بھر بچے پیدا کر کے دوران زچگی چل بسی تو شاہ جہاں نے غریبوں کا خون چوس کر

اس کی یاد میں تاج محل بنا دیا۔ حالانکہ اس سے کہیں کم خرچ میں ایک طبی تحقیقاتی ادارہ بن سکتا تھا کہ دوران ولادت مائیں کیوں مرجاتی ہیں۔ باپ کیوں نہیں مرتے۔ کیونکہ ہیرو کو حسرت تھی وہ مرجاتا اور اس کی بچی کرن کو ماں کی محبت ملتی۔ نہ سہی باپ' جو یوں بھی دن بھر گھر سے باہر رہتا ہے۔ ہیرو دن میں ملازمت کرتا اور سہ پہر میں محکمانہ سپورٹس کلب چلا آتا۔ جہاں وہ Picker تھا۔ یوں اسے کچھ اضافی رقم مل جایا کرتی۔ ہیرو ہر کام خوش اسلوبی سے انجام دیتا' مگر اس کی زندگی کا محور اس کی بچی کرن تھی۔ کرن سانولی سی تھی' منی سی۔ بچپن تو بجائے خود خوبصورت ہوا کرتا ہے۔ جیسے سیوی کی صبح! مجھے کرن پیاری لگتی۔ ابتداء میں تو اس بچی کا کلب آنا جانا مجھے ناگوار گزرا لیکن ہیرو نے بپتا سنائی تو مجھے کرن سے ہمدردی ہوگئی۔ ہم اسے بسکٹ بھی دیا کرتے۔ کرن ہمارے ٹوٹے ہوئے شٹل کاک بھی جمع کر کے ساتھ ہی لے جایا کرتی۔ جانے وہ ان کا کیا کرتی ہوگی۔ ایک بار ہیرو نے مطالبہ کیا کہ اسے ڈیڑھ ہزار کیشیئر سے چٹ پہ لے دیا جائے۔ اگر میں اسے اجازت دیتا تو یہ ایک مثال قائم ہو جاتی۔ سارا عملہ ہی ایڈوانس مانگنے لگتا میں تو خاکروبوں کو بھی کرسمس کا ایڈوانس نہ دیا کرتا کہ یوں مسلمان عملہ عید کا ایڈوانس مانگنے لگتا۔ عملے کا گزارہ بمشکل ہو رہا تھا۔ اکثر ہمارے دفتر سے استعمال شدہ صابن تک غائب ہو جایا کرتے۔ کچھ روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ کسی اور آفیسر نے کیشیئر سے ایڈوانس دلا دیا ہے۔

میں نے ہیرو کو تنبیہ کی ''ادھار لینا آسان ہے' لوٹانا مشکل۔ اخراجات کیوں بڑھاتے ہو۔''

''میری بیٹی کرن بہت بہت دنوں سے ایک ٹیڈی بے عر مانگ رہی تھی امیر ملک ہتھیار فروخت کرتے کرتے جانے اب کھلونے بھی کیوں بیچنے لگے ہیں۔'' وہ گلوگیر

لہجے میں معذرت خواہ ہوا۔

''ہیرو تم جانتے ہو یورپ کا ایک مزدور جتنی تنخواہ لیتا ہے۔ اس تنخواہ میں ہمارے ہاں ایک سو اٹھائیس ملازم رکھے جاتے ہیں۔ تم کیا امریکن پوسٹ سے مقابلہ کرنے پہ تلے ہوئے ہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا تو ہیرو خجالت سے بولا ''نہیں! میں جانتا ہوں ان کے کتے اور ان کی بلیاں ہم سے بہتر حالت میں رہتی ہیں۔ کاش مالک مجھے یورپ کا کتا بنا دیتا!! دراصل کرن کو جو چیز بھی اچھی لگے وہ اسے ماں سمجھنے لگتی ہے۔ یہ کمبخت بے عر ایک شوکیس میں سجا تھا' کرن ہی کے قد کا تھا۔ جھٹ بولی اس کی آنکھیں میری ماں جیسی ہیں۔ میری ماں مجھے ان آنکھوں سے دیکھتی ہے' مجھے بے عر لے دو بابا۔'' پھر میری غربت کی وجہ سے خریدنے کی ضد چھوڑ دی مجھے بہت حیرت ہوئی' یہ تو اچھا بھلا نفسیاتی مسئلہ تھا۔ میری دلچسپی بڑھی ''پھر کیا ہوا؟ بال ہٹ سے کیا مات کھا گئے۔''

''پھر یہ کہ روزانہ ضد کر کے کرن مجھے اس دکان کے سامنے لے جایا کرتی اور محویت سے اس سفید ٹیڈی بے عر کو دیکھا کرتی گھنٹہ بھر بعد ہم گھر لوٹ آتے۔ حتیٰ کہ کرن اس بے عر سے یک طرفہ گفتگو بھی کرنے لگی ایک روز دکان کے مالک نے ہمیں اندر بلا لیا اور کرن سے پوچھا کہ وہ روز بے عر دیکھنے کیوں آتی ہے۔ کرن نے وہی جواب دیا' جس سے دکاندار کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے شوکیس سے ٹیڈی بے عر نکلوا کر کرن کو دے دیا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ دکاندار نے مجھے حواس باختہ پایا تو ہمدردی سے تسلی دیتے ہوئے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اس کی قیمت ڈیڑھ ہزار روپیہ ہے، جب چاہے قیمت دے دینا۔ قیمت ادا نہ بھی کی تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔'' اس کی مردانگی دیکھ کر میں نے جیسے تیسے ادھار لے کر قیمت ادا کر دی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کرن اب ماں کو زیادہ یاد نہیں کرتی ٹیڈی بے عر سے باتیں

کرتی رہتی ہے اسے ساتھ رکھتی ہے۔'' میں نے اس جذباتی ہیرو کو ڈانٹا۔ پھر چٹ منگوا کر پھاڑ ڈالی۔ ''آئندہ ایسا کام کیا تو بھگتو گے۔'' کیشیئر کو میں نے ڈیڑھ ہزار ادا کر دیا۔ زندگی اسی سکون سے گزر رہی تھی' دن میں دفتر اور شام کو بیڈمنٹن۔ کبھی اسلام آباد کی طویل مسطح سڑکوں پہ سپورٹس کار میں تیز ڈرائیونگ' اچانک ہفتہ آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو تقریباً پونے نو بجے صبح ایک ہولناک زلزلہ آیا۔ جس کی شدت ۷ء۶ تھی۔ دفاتر حسبِ سابق کام کر رہے تھے۔ یہ ایک طویل زلزلہ تھا۔ جس سے ہمارے دفتر کی سہ منزلہ عمارت جھول کھاتی رہی۔ بلند قامت عمارت اسی روز زمین بوس ہو گئی زلزلہ اس قدر شدید تھا کہ پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر بستیوں پہ آن گرے دریائے نیلم میں پہاڑ گرنے سے روانی بند ہو گئی اور جھیل سی بننے لگی' آس پاس کی آبادیوں کیلئے مزید خطرہ بڑھ گیا مجھے روح فرسا خبریں مل رہی تھیں۔ مظفر آباد اور بجیرہ اضلاع کے پوسٹ آفسز بری طرح تباہ ہوئے' راولہ کوٹ جی پی او زمین پہ آ رہا۔ عملہ ملبہ میں دب گیا۔ کئی ایک کو زخمی حالت میں نکالا گیا۔ پوسٹ ماسٹر کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ باغ جی پی او بھی تباہ ہو گیا۔ لینڈ سلائیڈنگ کے سبب نواح کے گاؤں تباہ ہوئے ہمارا عملہ وہاں پھنس کے رہ گیا ان تک کوئی امداد بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ گڑھی دوپٹا میں خاصہ نقصان ہوا۔ پوسٹ ماسٹر چناری' کلرک اور پوسٹ فرائض کی بجا آوری کے دوران دب گئے۔ عملہ کے زخمی ہونے والے لواحقین کی تعداد گیارہ تھی۔ جب کہ مرنے والے لواحقین کی تعداد ۳۸ تک جا پہنچی۔ آزاد کشمیر کے پوسٹل سٹاف کے ۱۷۸ افراد زخمی ہوئے۔

لینڈ سلائیڈنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ زخمیوں تک رسائی بھی دشوار تھی۔ بہت سے پوسٹ آفس مسمار ہو چکے تھے۔ خبریں دیر سے آ رہی تھیں۔ ہم نے فوری طور پر اسلام

آباد ہی میں ایک بحالی مرکز قائم کر لیا تھا۔ ہنگامی بنیادوں پہ کام ہو رہا تھا۔ ہم بھی War Footings پہ کام رہے تھے۔ دن رات کا تصور ہی مٹ چکا تھا۔ ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' کے مصداق انسانی عزم و ارادہ حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ہیرو نے ثابت کر دیا کہ وہ اسم با مسمیٰ ہے۔ ہیرو انتھک انسان تھا۔ دن رات کام میں جتا رہتا۔ کیا مجال جو کبھی کمر ہی سیدھی کی ہو۔ ریلیف کیمپ میں مرد و خواتین از خود سامان لیے چلی آ رہی تھیں۔ بعض خواتین دلچسپ حد تک معصوم تھیں۔ درجنوں بوتلیں منرل واٹر دے جایا کرتیں۔ حالانکہ پہاڑی دریاؤں اور چشموں کا پانی معدنیات سے پر ہوا کرتا ہے۔ سونامی نے صرف انسانی جانوں کا اتلاف کیا تھا۔ جب کہ زلزلے نے سارا انفراسٹرکچر ہی ملیامیٹ کر دیا' سڑکیں نیچے کھائیوں میں پڑی تھیں۔ بہت سی بستیوں کا نشان ہی مٹ گیا۔ کئی ایک آبادیاں پہاڑوں تلے دب گئیں۔ اشیائے خوردنی' لحاف' کمبل' سوئیٹر ہم متاثرہ علاقوں تک پہنچا رہے تھے۔ خیموں کی شدید قلت تھی ہم نے عالمی پوسٹل سٹاف سے بھی مدد مانگی اور اپنے ملک کے سٹاف سے بھی مدد کی درخواست کی۔ منی آرڈر اور سامان کے تھیلے آنے لگے۔ بڑی اور چھوٹی رقمیں بھی مل رہی تھیں۔ ایک نائب قاصد نے چالیس روپے بھی امدادی رقم میں ادا کیے۔ پاکستان بھر کے پوسٹل ملازمین نے منی آرڈر بھجوانے شروع کر دیے تھے۔ پوری قوم ساتھ دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہم سب ایک ہیں۔ میرے شہر کوئٹہ سے بھی امداد پہنچ رہی تھی۔ ہماری گاڑیاں دن رات مصروف کار تھیں۔ نامساعد حالات کے باوجود ہم امدادی سامان ان علاقوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ ہیرو دیوانہ وار کام کر رہا تھا۔ سامان وصول کرنا۔ ان کے پیکٹ بنانا۔ گاڑیوں پہ سامان لوڈ اور ان لوڈ کرنا۔ چند مرتبہ امدادی کیمپ لئے راولہ کوٹ اور مظفر آباد بھی گیا۔ حالانکہ وہ کرن کو کبھی اکیلا نہیں

چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے استفسار کیا تو جواب دیا کہ پڑوسی کے ہاں رہ لے گی۔ کرن نے خود ہی ضد کی ہے کہ ابا زلزلے والوں کی مدد کرو۔'' مجھے خوشی ہوئی کہ اپنی ماں کے بغیر دنیا میں اکیلی زندگی گزارنے والی بچی اس قدر انسان دوست ثابت ہوئی۔

ہماری ایمبولینس گاڑیاں زخمیوں کو پہاڑی علاقوں سے لا رہی تھیں۔ ان کی آباد کاری کا بھی مسئلہ تھا۔ غرضیکہ ہمیں فرصت نہ تھی۔ سہ پہر میں اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے ہماری مدد کیلئے آ جاتے۔ وہ پیکنگ کرتے۔ امدادی اشیاء کے پیکٹ بناتے۔ مزدوروں کی مانند دن رات کام کرتے۔ حتیٰ کہ اپنے سلائیس اور چائے یا کافی بھی ساتھ ہی لایا کرتے ہماری چائے اور کھانے سے وہ احتراز برتتے۔ ایک بے حد اداس اور بجھی ہوئی شام میں ہم سبھی امدادی کام میں منہمک تھے کہ چند بچیاں ہمارے ریلیف کیمپ میں داخل ہوئیں' کچھ ہچکچاتے ہوئے' شرماتے ہوئے وہ میرے پاس آئیں' ایک تو اپنی کرن تھی بانہوں میں سفید ٹیڈی بےعر تھا' دوسری دونوں بچیوں کے ہاتھوں میں کچھ استعمال شدہ کھلونے تھے'' انکل یہ کھلونے زلزلے سے متاثرہ بچوں کو دے دیں' ہمارے پاس پیسے بھی ہیں یہ بھی انہیں دے دیں۔''

میں مبہوت سا رہ گیا۔ انہوں نے کچھ ریزگاری مجھے دی'' پورے پندرہ روپے ہیں آپ بے شک گن لیں''۔ انہوں نے اپنے کھلونے میری میز پہ رکھ دیئے۔ مجھے یوں لگا کہ ان بچوں نے گولکنڈہ کا خزانہ مجھے سونپ دیا ہے۔ کرن نے مجھے اپنا ٹیڈی بےعر دے دیا'' یہ بھی زلزلے والوں کو دے دیں۔'' میری قوت گویائی سلب ہو کے رہ گئی۔

میں فخر سے ان بچوں کو دیکھنے لگا۔ میرے پاس بہادری وایثار کا اعلیٰ ترین تمغہ ہوتا تو ان کے گلے میں پہنا دیتا اس سے پہلے کہ میری قوت گویائی واپس آتی۔ تینوں

بچیوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور کیمپ سے نکل گئیں۔ ان کی طمانیت اور ارادوں کی پختگی مجھے یاد رہی۔ کرن نے مڑ کے بھی ٹیڈی بےعر کو نہ دیکھا۔ اس نے زلزلہ زدگان کیلئے شفیق آنکھوں کا سرمایہ زندگی نذر کر دیا تھا۔ معاً مجھے ٹیڈی بےعر زندہ محسوس ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا وہ محبت سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

اگلے روز دفتر کے کام نمٹا کر کیمپ میں داخل ہوا تو ٹرک تیار کھڑا تھا۔ سامان لوڈ کیا جا رہا تھا۔ کھلونے بند کئے جا رہے تھے مگر ٹیڈی بےعر غائب تھا۔ میں نے انچارج سے استفسار کیا۔ '' ٹیڈی بےعر کہاں گیا؟''

'' رضا کار لڑکے دو ہزار روپیہ جمع کرا کے ٹیڈی بےعر لے گئے۔''

'' چلو اچھا ہوا اس وقت رقم کی ضرورت تھی۔ مگر لڑکے اس کا کیا کریں گے۔''

'' انہوں نے وہ ٹیڈی بےعر کرن کو تحفتہً دے دیا ہے۔''

دودھ پتی

جن دنوں حمید کی دودھ پتی سے منگنی ہوئی ۔ جی مسوس کے رہ گیا ۔ دودھ پتی کو سورج کے رس میں چاند کی کرنیں ملا کر تخلیق کیا گیا تھا ۔ خوبصورت لڑکیاں سکوں کی طرح دولت مندوں کے کشکول میں جایا کرتی ہیں ۔ چھن چھن کرتی ہوئیں ۔ قدرت کے عدل پہ جی کڑھتا ۔ عادل تو سبھی کو یکساں مواقع دیا کرتے ہیں ۔ یہاں تو کوئی فقیر کے ہاں پیدا ہوتا ہے تو کوئی قارون کے ہاں اگر انسان یکساں ہیں تو صرف بنیادی ضرورتوں کی حد تک ۔ سبھی پانی پیتے ہیں' سبھی سانس لیتے ہیں ۔ اس حسین وجمیل لڑکی حمید کو بھی لے اڑا اور میں ہاتھ ملتا ہی رہ گیا ۔ میرا باپ شریف تھا اس لئے وہ غریب تھا ۔ شرافت اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ الحاج نیک محمد مجھے گاؤں سے لے آئے تھے کہ میں ان کے بیٹے حمید کے ساتھ رہوں' اچھے کالج میں پڑھوں ۔ میں ان کا قریبی عزیز تھا ۔ لہٰذا گھر میں حمید کے ساتھ کا کمرہ مجھے دے دیا گیا ۔ دودھ پتی کا Basic Ingredient حسن تھا' ہاتھ' انگلیاں' ٹھوڑی' آنکھیں' مژگاں' ابرو' غرضیکہ ہر شے حسین تھی ۔ پانی کی بجائے دودھ میں پتی ابال کے جو چائے بنائی جاتی

ہے اس میں نرالی دلربائی ہوا کرتی ہے جیسے سونے میں پلاٹینیم کی آویزش یا سورج میں چاند کی ملاوٹ ۔ تبھی حمید اس شاہکار کو دودھ پتی کہا کرتا ۔

دونوں کا مزاج الگ تھا دودھ پتی کو تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی جب کہ حمید کو تعلیم سے بیر تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم انسان کو بزدل بنا دیتی ہے ۔ دودھ پتی پڑوس میں رہتی تھی ۔ حمید نے منگنی کے بعد اس سے روابط بڑھانا چاہے ۔ دودھ پتی نے محبت ناموں اور فون تک اکتفاء کی جس سے کچھ عرصہ بعد ان کے تعلقات میں کشیدگی سی پیدا ہوگئی حمید ہر چیز روپے سے خریدنے کا عادی تھا ۔ جب کہ دودھ پتی کی نظروں میں روپے کی اہمیت نہ تھی ۔ چند بار حمید نے اسے کافی بڑی رقم تحفہ خریدنے کیلئے دینا چاہی تو اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا ''تحفہ ہی دینا ہے تو جان ملٹن کی کتابیں لے دو ۔ شیکسپیئر کا میکبتھ لے دو ۔'' ایک بار حمید نے ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈی پیش کی تو دلربائی سے بولی ۔ ''میں اس کا کیاں لوں گی ؟ تم اس کی کتابیں خرید کر غریب بچوں میں بانٹ دو ۔ ان کی وردیاں سلوا دو ۔ انہیں بستے دلوا دو ۔'' حمید زچ ہو جایا کرتا کٹ کر رہ جاتا ۔ اس کی دولت کا گھوڑا محبت کے Troy میں داخل ہونے میں ناکام رہتا ۔ حمید قرب چاہتا تو دودھ پتی مدافعت کرتی اسی چھینا جھپٹی میں اس کے تعلقات دودھ پتی سے مزید خراب ہوتے چلے گئے ۔

مالک جسے جتنا چاہے دیتا ہے ۔ الحاج کو بھی مالک نے خوب نوازا ۔ کیونکہ انسانوں کے رزق کا کوٹہ سسٹم ہوتا نہیں مولا جسے جس قدر دے یہ تو اس کی مرضی پہ منحصر ہے ۔ الحاج کسی زمانے میں چرس بیرون ملک بھجوایا کرتے ۔ بہت سی دولت ہاتھ لگی زمانہ بدلا تو چرس بھی پچیس بور کے پستول کی مانند غیر اہم ہو کے رہ گئی ۔ ہیروئن کا زمانہ آیا تو الحاج قالینوں پہ خوب اچھی طرح ہیروئن مل کر انہیں ایکسپورٹ کر دیا

کرتے ۔امریکہ میں ان کے ایک ساتھی ویکیوم کلینز سے ہیروئن کھینچ کر سونے کے بھاؤ فروخت کرتے ۔الحاج نے اہل خانہ کو بھی حج کروائے ۔ایک مسجد بھی بنوائی ۔پاس پڑوس آزو بازو کے مکان خرید کر انہیں بھی اپنے گھر میں شامل کر لیا تھا یوں تو کہنے کو محلے کا گھر تھا ۔مگر اس پہ محل کا گماں ہوتا ۔الحاج نیک انسان تھے ۔پابند صوم و صلوٰۃ تھے ۔علاقے بھر میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ۔میں حمید کا دوست' کلاس فیلو' ڈرائیور' باڈی گارڈ اور کیشیئر تھا ۔وہ اپنا روپیہ میرے پاس رکھتا اور میرے ذریعے خرچ کرتا ۔اکثر پی کے بہک جایا کرتا ۔بعض اوقات مجھ پہ مکا تان کر کہا کرتا ''میرے مکے میں اتنی طاقت ہے کہ اگر بیل کو مکا ماروں تو وہ گر پڑے ۔'' میں نے اسے کسی کو مکا مارتے نہ دیکھا ۔البتہ حسینائیں حمید پر تابڑ توڑ حملے کرتی رہیں ۔اس کی دولت لوٹتی رہیں ۔دونوں ہاتھوں سے ۔ادھر مالک مہربان تھا رزق میں کمی نہ آتی ۔یوں لگتا حمید کو حسین خواتین کے نام پہ دیا جا رہا ہے ۔وہ اپنی دولت اور مردانہ طاقت کے ہاتھوں آدھ مویا سا رہتا ۔

ایک رات ڈرگ مافیا کے جھگڑے میں الحاج مارے گئے ۔یہ صدمہ حمید نے شراب اور حسیناؤں کے سہارے جھیل لیا ۔دودھ پتی تعزیت پہ آئی تو حمید رکھائی سے پیش آیا فاتحہ خوانی کی بجائے وہ دودھ پتی سے الجھ پڑا ۔''لوگ کہتے ہیں کہ شکر ہے کہ الحاج جمعہ کے دن فوت ہوئے' شکر ہے کہ چہرے پہ گولیاں نہیں لگیں ۔میرا باپ جمعے کو مرے یا ہفتے کو اس میں خوشی کی کیا بات ہے مبارک باد کے کارڈ شکر ہے کہ نہیں بھجوائے لوگوں نے !امریکی ہیروئنچی البتہ واقعی مغموم ہوں گے اب انہیں ہیروئن کہاں ملے گی ۔اور تم اتنے آنسو کس کیلئے بہا رہی ہو؟ تمہارا مجازی خدا ہوں بات مانو میری ۔''

دودھ پتی نے آنسو پونچھ ڈالے ۔''آنسو بہا رہی ہوں تمہاری عقل اور اپنی قسمت پر ۔تم نے اتنی عورتیں کیوں جمع کر لی ہیں ۔اتنی شراب کیوں پیتے ہو؟'' حمید تو مدہوش تھا اس نے توجہ نہ دی ۔میرا جی چاہا کہ دودھ پتی کا ہاتھ تھام کے کہوں وہ مجھ سے شادی کر لے ۔حمید تو مان ہی جاتا ۔مگر ہمت نہ پڑی ۔اگر حمید مجھے چلتا کرتا تو میرے مستقبل کا کیا بنتا غلامی اور جی حضوری میں مستقبل پنہاں تھا ۔سرکاری افسر بن کے تو یوں بھی عمر بھر جی حضوری کرنا تھی ۔اچھا ہے اپنا نفس اپنے ہی ہاتھوں روز ذبح ہوتا رہے ۔اپنے نفس کو صلیب پہ لٹکا کر ہی تو ترقی اور خوشحالی ملتی ہے ۔

دودھ پتی نے ایک تباہ کن نظر مجھ پہ ڈالی ایسا جلوہ طور تھا کہ میں ہلاک ہوتے ہوتے بچا اس نے مجھے مخاطب کیا ''ایک روز حمید خود میرے پاس آئے گا ۔تم گواہ رہنا ۔''

حمید پر عورتیں من و سلویٰ کی مانند برس رہی تھیں ۔جانے کہاں سے اتر آتیں ۔یوں لگتا ۔کائنات میں عورت کے سوا ہے کچھ نہیں اور سارے مرد عورتوں کے غلام ہیں' عورتوں کے کپڑے سی رہے ہیں' زیور بنا رہے ہیں ۔ان کا سامان لانے کیلئے دن رات ٹرک چلا رہے ہیں ۔جہاز اڑا رہے ہیں ۔ایک ہی برس میں الحاج کا بینک بیلنس حمید نے اڑا دیا بڑی بڑی رقمیں فلاش میں ہار بیٹھا ۔ماں اس صدمے سے دم توڑ گئی ۔اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں اکیلے رہ گئے ۔یوں تو یہ گھر حسیناؤں کا ٹاپو تھا ۔خدشہ تھا کہ میری افسری سے پہلے ہی حمید دیوالیہ نہ ہو جائے ۔اس لئے میں بھی زیادہ روپیہ طلب کرنے لگا ۔کچھ ہاتھ بھی مار لیا کرتا ۔Rainy Day کیلئے حالانکہ بلوچستان میں بارش نہیں ہوتی میں انگریزی والے Rain Day کو قریب تر محسوس کر رہا تھا ۔حمید چونکہ دل پھینک تھا ۔اس لئے ہر سنگدل محبوب کو قدموں میں لانے والے

عاملوں سے بھی رابطے رکھتا۔ محبت کے تعویذ خریدا کرتا۔ کتنے ہی تعویذ رات کے اندھیروں میں دودھ پتی کے گھر کی دہلیز کے نیچے دفن کر آیا' بعض تعویذوں پہ تو میں نے عامل سے منت سماجت کر کے اپنا نام لکھوایا بجائے حمید کے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ حسیناؤں کے قریب آنے' ہاتھ تھامنے اور جسم کی خوشبو سے حظ حاصل کرنے کیلئے اس نے علم نجوم سے پہلے دست شناسی سیکھی۔ حسین خواتین بے تکلفی سے اپنا ہاتھ نجومیوں کے ہاتھ میں دے دیا کرتی ہیں۔ اس لئے اکثر دل پھینک دست شناس بن جاتے ہیں حمید پہ عجیب سا کیف طاری ہوتا اس کی جبلی قوت بڑھ جایا کرتی بھوکے بھیڑیئے کی مانند اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی' عورت کو وہ کسی اخبار کی طرح فرفر پڑھنے لگتا۔ دودھ پتی مجھے دس پندرہ روز بعد بلوا بھیجا کرتی' کچھ خاطر مدارت کرتی اور پھر حمید کی خیریت دریافت کرتی۔ اسے یقین تھا کہ حمید مفلس ہو کر ٹھوکریں کھا کر اس کے پاس ہی پلٹ پڑے گا۔ وہ مقامی اسکول میں انگلش ٹیچر لگ گئی تھی۔ حمید کا تاثر تھا کہ وہ مرد طوائف بن چکا ہے' ایک عورت پہ محدود نہیں رہ سکتا۔ دودھ پتی بیوی بن کے آئی تو اس پہ مارشل لاء لگا دے گی۔ یا وہ دودھ پتی کو قتل کر ڈالے گا یا پھر دودھ پتی اسے جان سے مار ڈالے گی۔ یہاں تو ہر روز نئے چہرے ہوا کرتے' ہر شب نرالی ادائیں۔ رقص وموسیقی کا شوق بھی بڑھا۔ سنگدل حسیناؤں کے دل تو موم ہوئے جا رہے تھے۔ مگر دولت بھی برف کی مانند پگھل رہی تھی۔ جیسے تکتو کی چوٹیوں کی برف جو یوں غائب ہوتی کہ پانی بھی بن نہیں پاتی۔ حمید دھڑا دھڑ جائیداد بیچتا چلا گیا۔ اور جب میں منتخب ہونے کے بعد اکیڈمی جانے لگا تو حمید نے خوب بڑھیا سوٹ سلوا کر دیئے۔ بہت سا روپیہ بھی دیا یہ ضد بھی کی کہ میں جانے سے قبل میں آخری بار دودھ پتی کو ملوں اور اس سے آخری بار درخواست کروں کہ یورپ میں تو ٹھوک بجا کر شادی

کی جاتی ہے جب کہ ہمارے ہاں بغیر دیکھے ہی شادی کر دی جاتی ہے۔ حمید بدستور دلیل بازی کرتا رہا۔ دودھ پتی کو خوشی ہوئی کہ میرا مستقبل بن گیا ہے۔ مگر اس کا بدستور موقف رہا کہ حمید اس سے شادی کرے۔ تب وہ اس کے گھر میں قدم رکھے گی۔ اس کے حسن پہ پاکیزگی کا تاثر تھا۔ جس کے سبب نگاہ ملنے پہ گیارہ ہزار وولٹ کا جھٹکا مارتی ۔ میں نے اشارتاً اسے کہا کہ اگر کوئی اچھا انسان اسے شادی کی پیش کش کرے تو کیا وہ کچھ سوچے گی۔ ''جی نہیں! میں حمید کی منگیتر ہوں' شادی بھی اسی سے کروں گی۔''

میں نے وقت رخصت حمید کو نصیحت کی۔ ''دودھ پتی سے شادی کر کے شریفانہ زندگی گزارو۔ کہیں تم سے اگلی ملاقات جامع مسجد کی سیڑھیوں پہ ہی نہ ہو۔ جہاں فقراء کو باقاعدگی سے خیرات ملا کرتی ہے۔'' حمید نے بات ہنسی میں اڑا دی۔ ''میں قسمت کا دھنی ہوں۔ مجھے تم دشت گوران میں بھی چھوڑ آؤ تو حسینائیں وہاں ہی چلی آئیں گی۔ جانے عورتیں مجھ پہ اس قدر مرتی کیوں ہیں؟''

''حمید! اگر وہ تمہیں تابوت میں بند کر کے ساتھ ہی لیتی جائیں تو بہتر ہو۔''

اکیڈمی میں زندگی بے حد مصروف ہوگئی۔ رفتہ رفتہ میں کوئٹہ کو بھولتا گیا۔ بلوچستان کو بھی اور اپنے آپ کو بھی پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ حمید سود خوروں کے چنگل میں پھنس کر اپنا مکان بھی گنوا بیٹھا۔ حمید دن میں کاسی روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھا لوگوں کے ہاتھ دیکھنے لگا' قسمت کا حال بتانے لگا۔ شالدرہ میں ایک کھولی کرائے پر لے لی۔ دودھ پتی نے بالآخر اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔ حمید نے جو دور سے دودھ پتی کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو ''قسمت کا حال معلوم کریں'' والا بورڈ اور بوریا چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جانے کہاں گیا' کچھ پتہ نہ چلا۔

پردیس سے لوٹا تو حمید کے گھر کی جگہ ایک پلازہ زیر تعمیر تھا۔ دودھ پتی کے گھر پہ

ایک مخبوط الحواس چوکیدار تھا۔ جو اس کے بارے میں صرف اتنا بتلا سکا کہ ملازمت کے سلسلہ میں خضدار چلی گئی ہے۔ میری تعیناتی سیوی میں ہوگئی ایک روز سٹیشن روڈ سے گزر رہا تھا کہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے نجومی نے توجہ کھینچ لی۔ غور سے اس شکستہ حال انسان کو دیکھا تو اس کے اسکے چہرے سے حمید ابھر آیا۔ اپنی افسری کی پرواہ کئے بغیر ہی میں جیپ رکوا کر اترا اور حمید سے بغلگیر ہوا۔ وہ مجھے ساتھ لے کے چینکی ہوٹل میں لے گیا' وقت نے اسے قابل رحم بنا دیا تھا۔ مجھ سے بیس تیس برس بڑا لگ رہا تھا۔

''بس سب کچھ ختم ہوگیا۔ کچھ مت پوچھنا آج کی بات کرو لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں۔'' پرانی کار کی طرح اس سے بدبو پھوٹ رہی تھی۔ ''جانے دو' میری قسمت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ دودھ پتی کا کیا بنا؟'' میں نے کریدنے کی خاطر لاعلمی اختیار کر لی۔

''بڑی پاگل ہے' مجھے ٹھرے سے لینے آئی تھی میں یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ اندھا دھند دوڑا ریلوے سٹیشن پہ بولان میل روانہ ہو رہی تھی۔ بغیر ٹکٹ لئے ہی لپک کر ایک ڈبے میں جا بیٹھا۔ مشکاف سٹیشن پہ سوچا کہ پردیس میں بھلا کیا مرنا۔ اس لئے سیوی پہ اتر گیا۔ دن بھر ہاتھ دیکھتا ہوں زائچے بناتا ہوں۔ رات کو ڈغڈغا کے ٹھرا پیتا ہوں۔ مزے میں گزرتی ہے۔ پہلے میں زندگی گزار رہا تھا۔ اب زندگی مجھے گزار رہی ہے۔ جھالاوان میں کھانے کو کچھ ملتا نہیں۔ وہاں پچیس برس میں ہی نوجوان بوڑھے ہونے لگتے ہیں۔ میں جلدی بوڑھا ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بھلا۔'' ہوٹل کا مالک میرا سنتے ہی دوڑا چلا آیا' اسے معلوم ہوا کہ حمید میرا دوست ہے تو اس نے ایک دکان حمید کو فوراً دلوا دی۔ میری افسری خاصی کام آئی' اسی ہوٹل کے اوپر ایک کمرہ بھی اس کی رہائش کیلئے خالی کر دیا گیا۔ اب وہ ٹھرے کی بجائے دکان میں کام کرے گا۔ مجھے

اطمینان ہوا۔ میں نے چند ماہ کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر دیا۔ چند ہی روز بعد میں دوبارہ حمید سے اس کے کمرے میں ملا۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں' سیوی کے صحت مند مچھر خون چوس رہے تھے۔ مگر وہ مجھ سے مل کر کھلا جا رہا تھا۔ چائے آئی تو میں دل کی بات زبان پہ لے آیا۔

''حمید! اگر تم اجازت دو تو میں دودھ پتی کو تلاش کروں؟'' اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔

''وہ کیوں؟'' لہجے میں استفسار تھا۔

''یہ ایک بہت بڑا راز ہے حمید دراصل میں نے ہمیشہ اسے چاہا۔''

حمید کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرا اور بکھر گیا۔ اس نے چارپائی کے نیچے پڑا بوسیدہ لوہے کا ٹرنک گھسیٹا۔ جلدی سے ٹھرے کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ آدھا چڑھا گیا۔ ''کیا تم اس سے شادی کرو گے۔'' اس نے خود پہ قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔''

ہاں! میں اس سے شادی کروں گا۔''

حمید سنبھل چکا تھا ''میرا تو اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ تم ایک اچھے انسان ہو مجھے خوشی ہوگی۔ مگر وہ ہے کہاں میں نہیں جانتا! بلکہ جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' جانے کیوں وہ بجھ سا گیا تھا۔

اگلے ہی ہفتے ایک سرکاری تقریب کے سلسلہ میں گرلز ہائی سکول جانا پڑا۔ یہ دیکھ کر رگوں میں میرا خون منجمد ہوگیا کہ دودھ پتی ہی سکول کی پرنسپل تھی۔ اسے بھی خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ گوارخ اور جوار کے پھول کی طرح شاداب و تروتازہ تھی۔ اس کے چہرے پہ راہباؤں والی تقدیس تھی۔ کرشن بھگوان جیسی الوہیت تھی۔ مقدس چیزوں پہ وقت اثر نہیں کرتا۔ یہی سبب ہے کہ وقت اسے چھوئے بغیر ہی گزرتا رہا تھا۔

تقریب کے بعد مہمانوں کو رخصت کر کے وہ مجھے اپنے دفتر میں لے آئی۔ طالبات کی گہما گہمی تھی' ملا جلا شور تھا۔ اس نے بہت اپنائیت سے بار بار خیریت پوچھی اپنے ہاتھوں چائے بنائی بسکٹ بڑھائے اور حمید کا پوچھا۔ حمید مجھے شادی کی اجازت دے چکا تھا میرا حوصلہ بڑھ چکا تھا'' کیا تم اب بھی اسے اپنا لو گی۔''

'' ہاں! منگنی اور شادی میں فرق ہی کتنا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تھک ہار کر میرے پاس ہی آئے گا۔''

میں جیتی ہوئی بازی ہار رہا تھا۔ میرے دل میں انتقام کی آگ سلگ اٹھی'' حمید اسی شہر میں ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے ساتھ رہتا ہے۔ میں اسے ملتا رہا ہوں۔ الفتح کے گوریلوں والی چادر سر پہ لپیٹے رہتا ہے' عقیق اور دوسرے پتھر کی بہت سی انگوٹھیاں پہنے پھرتا ہے' ہاتھ میں تسبیح رکھتا ہے۔ روحانی شخصیت کا روپ دھار کر نجومی گیری کرتا ہے''۔ دودھ پتی بے چینی میں کرسی سے اٹھ بیٹھی۔'' مجھے اس کے پاس لے چلو' اس بار نہ ہاتھ سے نکل جائے اور تم اسے اس سڑے ہوئے ہوٹل میں چھوڑ آئے۔ جس نے تمہیں ایئر کنڈیشنڈ کارپیڈ گھر میں رکھا۔ تم نے اسے مچھروں اور غربت کے حوالے کر دیا۔ اسی کو کہتے ہیں احسان کا بدلہ''

میں نے دل کا کرب چھپا لیا'' تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں میں ہی لے آؤں گا۔''

'' میں گاڑی میں بیٹھی رہوں گی۔ پلیز مجھے ساتھ لے چلو''اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس کے یاقوتی لب کانپ رہے تھے' بڑی مشکل سے میں نے سمجھایا کہ کل سویرے لے آؤں گا۔ اور جلدی سے رخصت ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ حمید کا چہرہ صبح سویرے دیکھ کر دودھ پتی اپنا ارادہ بدل لے گی۔ پھر مجھے قبول کرنے میں دودھ

پتی کو کوئی تامل نہ ہوگا۔ گھر آ کر فتح کے سرور میں گہری نیند سو رہا۔

اگلے روز حمید کی دکان میں ہوٹل کا ملازم نجومی بنا بیٹھا تھا۔ حمید کی چادر' انگوٹھیاں پہنے۔ مجھے سامنے پا کر مؤدب سا اٹھ بیٹھا۔ میرے استعجاب کو دور بھی کر دیا'' یہ سارا سامان حمید نے رخصت ہونے سے پہلے مجھے دیا تھا۔ پورا ہوٹل گواہ ہے۔'' میرے دل میں انبساط کی لہر دوڑ گئی' جیسے ٹھنڈی خنک ہوا کا لطیف جھونکا۔'' حمید کب فوت ہوا۔''

'' فوت! فوت تو نہیں ہوا آپ کے جانے کے بعد دن رات ٹھرا پینے لگا تھا۔ لوگ کہتے تھے صاب نے اس کے دل کا زخم کھول دیا ہے۔ کل رات اسکول کی پرنسپل اس کا پوچھتی پچھاتی یہاں آئی۔ حمید کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نشے سے بیدار کیا اور کار میں بٹھا کر ساتھ لے گئی۔''

پیاز

میری پہلی پوسٹنگ بطور میڈیکل آفیسر سوراب میں ہوئی۔حالانکہ میں خضدار یا کسی بڑے شہر میں رہنا چاہتا تھا۔ یہاں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ پوسٹ کوئی سال بھر خالی رہی تھی ۔ چھوٹی جگہوں پہ جانے کیلئے کوئی بھی تیار نہ ہوتا۔ ڈاکٹر حق بجانب بھی ہیں ۔ کیونکہ باہر زندگی کی کوئی سہولت نہیں ملتی ۔ نہ بچوں کیلئے اچھا اسکول نہ بجلی' شدید موسم' نامساعد حالات' سوراب ہائی وے سے دو کلومیٹر دور ہے ۔ کوئٹہ کراچی ٹریفک دن رات جاری رہتی ۔ ہیلتھ یونٹ کی عمارت اچھی تھی' درختوں میں گھری ہوئی ۔ مکان بھی ٹھیک ہی تھا' تین افراد پہ مشتمل سٹاف بھی اچھا ہی لگا ۔ دو کا تعلق سوراب ہی سے تھا۔ جب کہ ڈسپنسر ہری چند کا تعلق قلات سے تھا۔ ہر طرف پیاز کے کھیت بکھرے ہوئے تھے ۔ سبزہ ہی سبزہ رونق ہی رونق ۔ جب کہ دائیں بائیں خشک اور بنجر پہاڑ تھے' جن سے پیاسی بالو آ کر سبزے سے نمی چوس لیا کرتی ۔ بجلی بھی تین چار گھنٹے کیلئے آیا کرتی ۔ یہاں دوستانہ ماحول تھا' جلد ہی میں مقامی آبادی سے گھل مل گیا ۔ آس پاس کے دیہاتوں سے بھی مریضوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ۔ بعض

اوقات مجھے مریض دیکھنے بھی جانا پڑتا۔

اس بار پیاز کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی ۔ ہائی وے پہ چلتے چلے جائیں تو کھڈ کوچہ اور مستونگ تک ہریالی چھائی ہوئی تھی ۔ کاشتکار بھی خوش تھے کہ اس بار کافی روپیہ کمانے کا موقعہ ملے گا' ان کے بہت سے خواب تھے' بہت سے منصوبے' کوئی مکان کی مرمت کروانا چاہتا تھا تو کوئی شادی کا خواہاں تھا۔ کسی نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کیلئے کوئٹہ یا خضدار بھجوانا تھا۔ وہ سادہ سے لوگ تھے مجھ سے ہر بات کر جایا کرتے' ڈاکٹر کو تو وہ بہت بلند رتبہ دیا کرتے' سبزیاں اور گوشت تک میرے اردلی کو بلا قیمت دیا کرتے ۔ بعض تو دنبے یا بکرے بھی دے جایا کرتے ۔ جس سے میں بھی جوابی دعوت کر دیا کرتا' پیاز کی فصل بہار دکھا رہی تھی ۔ میلوں پھیلی بکھری آبادیوں کا روزگار ہی پیاز سے وابستہ تھا۔

بلوچستان کے کاشتکار سال بھر میں صرف ایک فصل حاصل کرتے ہیں ۔ اب تک اونٹ کے ذریعے ہل چلاتے ہیں ۔ درختوں کے نیچے بیٹھ کر پرسکون ماحول میں لسی پیتے ہوئے میں کاشتکاروں کو دیکھ دیکھ سوچا کرتا کہ یہ حضرت ابراہیم کا دور ہے یا کہ اکیسویں صدی ۔ لیکن جانے کیوں صدیاں بلوچستان سے روٹھی روٹھی دور کھڑی رہتی ہیں ۔ وقت کسی دق زدہ کے مریض کی طرح بلوچستان سے دور کسی وارڈ میں خون تھوکتا رہتا ہے ۔ یہاں مختلف قبائل کی ملی جلی آبادی تھی مگر سبھی باہم شیر و شکر تھے ۔ اکثر مجھے کھانے پہ مدعو کیا جاتا' دوپہر تک مریض دیکھا کرتا ۔ پھر آرام کر کے کسی میر معتبر کے ہاں جا نکلتا۔ "ڈاخکٹر صاحب ۔ ڈاخکٹر صاحب" ہر جانب سے استقبال ہوتا' بعض اوقات رات گئے مجھے کسی قریبی دیہات میں بلوالیا جاتا' میں بلا تکلف روانہ ہو جاتا' بلوچستان کی ستر فیصد آبادی غربت کی سطح سے نیچے رہتی ہے مریضوں کے ہاں جانے

کی میں نے کبھی فیس طلب نہ کی۔ مجھے عار محسوس ہوتی لیکن لواحقین حسب توفیق خود ہی میری جیب میں روپے ڈال دیا کرتے۔ ان کی سہولت کیلئے میں ہمہ وقت جیبوں والی واسکٹ پہنا کرتا۔

میر معتبر ٹکری زبردستی جیب میں نوٹ ڈال دیا کرتے ''یہ آپ کی فیس نہیں ڈاکٹر صاحب یہ دعوت ہے ہمارا کھانا تو آپ کھاتے ہی نہیں۔''

ہیلتھ سینٹر کے سامنے آٹھ کمروں پر مشتمل مڈل سکول تھا' جس پہ قومی جھنڈا لہراتا رہتا۔ حب سے لے کر تھانہ سونا خان تک یہ واحد جھنڈا تھا۔ جو ٹکری گہرام نے لگایا تھا۔ وہ بڑا ہی محب وطن تھا عمر میں تو مجھ سے پچیس تیس برس بڑا رہا ہوگا۔ مگر اس سے بڑی گہری چھننے لگی' اس کی محبت وطن سے ایسی جذباتی تھی کہ رات بھر بھی جھنڈا لہراتا رہتا' بستی والوں کو جھنڈا لہرانے کے آداب سے آگاہی نہ تھی۔ میں نے بھی توجہ نہ دلائی۔ سادہ دل انسانوں کی محبت بھی بہت معصوم اور جذباتی ہوا کرتی ہے۔ گہرام کے ٹریکٹر کے سامنے بھی جھنڈا بنا ہوا تھا۔ واحد آرٹسٹ قلات میں تھا گہرام ٹریکٹر چلاتا قلات گیا تھا نہایت ہی چاہت سے ٹریکٹر کے سامنے قومی پرچم بنوا کر خوش خوش لوٹا۔ اس کے مہمان خانے میں نہایت آرام دہ فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ ایک جانب دفتروں میں سجایا جانے والا قومی پرچم سج دھج دکھاتا۔ بقول گہرام یہ قومی پرچم اسے بہادری کے انعام میں کسی کرنل نے دیا تھا۔ پرچم پہ وقت کا سایہ پڑا ہوا تھا برسوں ڈھلتے رہنے سے کچھ مسک سا گیا تھا۔ گہرام کی وطن دوستی مجھے بہت اچھی لگتی۔ حب الوطنی مومن کا نشان ہے۔

وہاں بجلی نہ تھی ٹیلی ویژن بھی کام نہ کرتا۔ لہٰذا آپس میں میل جول زیادہ تھا۔ اکثر سہ پہر میں دوست احباب ٹکری گہرام کے ٹیوب ویل پہ چلے جاتے۔ شام تک

خوب محفل جمتی۔ لطیفے سنائے جاتے عام سے قصے عام سے واقعات قہقہوں کا سبب بنتے' میرا ڈسپینسر ہری چند ہنسنے ہنسانے کیلئے عامیانہ گفتگو بھی کرنے لگتا کبھی جگت بازی پہ اتر آتا۔

سہ پہر میں جب لدگشت' گلنگور اور دشت گواران کی جانب سے بادِ سموم سوراب کے کھیتوں سے نمی کشید کرنے آتی ہم ان درختوں کے نیچے پناہ لیتے جہاں گہرام نے لسی' کرت اور سبز چائے کا اہتمام کر رکھا ہوتا۔ آگ اگلتا سورج ہمیں درختوں کے نیچے تلاش کرتا رہتا۔ دھوپ گھنے درختوں سے چھن چھن کر آتی۔ ہری چند تو گہرام سے خاصہ بے تکلف تھا۔ ایک ایسی ہی گرم سہ پہر میں چائے کا دور چل رہا تھا کہ ہری چند کی نظر ٹریکٹر کے جھنڈے پر پڑی۔ گہرام کا ملازم اس ٹریکٹر کو آب جو پہ دھو رہا تھا۔ ہری چند نے بھولے پن سے سوال کیا۔ ''میر صاحب! یہ جھنڈا کچھ سبز ہے۔ کچھ سفید۔ اس کا کیا مطلب ہے۔''

گہرام نے چائے کی پیالی قالین پہ رکھ دی۔ ''ہری چند یہ سبز رنگ مسلمانوں کی علامت ہے اور سفید رنگ اقلیتوں کی۔'' ہری چند نے آہ بھری۔ ''جھنڈے کا ڈنڈا آپ اقلیتوں کے اندر سے گزارتے ہیں ساٹھ برس گزر گئے اتنا کافی نہیں کیا؟''

گہرام مُکا تان کے ہری چند کی جانب لپکا۔ ہری چند کودتا پھاندتا باغ میں جا گھسا۔ گہرام کچھ دیر تو اس کا پیچھا کرتا رہا۔ پھر ہمارے پاس آ کر ڈھیر ہو گیا۔ ''کمال ہے کتنا تیز دوڑتا ہے' مجھے اتنی جلد شہید ہونے کا شوق نہیں اس لئے واپس آ گیا ہوں۔ واپس آ جاؤ ہری چند تمہیں جان کی امان دی جاتی ہے۔'' ہری چند دوبارہ چائے پینے لگا' سبھی ہنسے جا رہے تھے۔ ''ہری چند گائے تمہاری ماتا ہے کیا؟'' گہرام نے سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے وار کیا۔ ''جی ہاں بکری آپ کی خالہ اور اونٹ آپ کا چچا ہوگا تو میری بھی

عزیز داری ضروری ہے۔"

ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے' ایسے خوبصورت ماحول میں وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ پیاز کی فصل بھی اب تیار تھی' پیاز باہر نکالی جا رہی تھی' گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ہر چہرہ شادمان تھا' ہر فضا مسکراہٹوں سے معطر تھی۔

دو ماہ گزر چکے تھے' گھر جانا بھی ضروری تھا' پندرہ روز کی چھٹی منظور کرا لی۔ گہرام نے دعوت ہی کر ڈالی۔ بہت خوشگوار ماحول تھا۔ بجلی بھی اتفاقاً موجود تھی' مہمان خانے میں قہقہوں کی کھنک تھی۔ میں نے سوال کیا۔ "یہ جھنڈا سنا ہے کسی کرنل نے بہادری کے انعام میں دیا تھا"

"ہاں یہ سچ ہے' میں پوری کہانی سناتا ہوں" گہرام نے سینہ تان کر کہا "۱۹۶۵ء کی جنگ ہوئی تو میں کم عمر تھا' ہمیں بتایا گیا کہ اگر پاکستان کا ہر شہری محض ایک پیسہ ہی دفاعی ڈبے میں ڈالے تو روزانہ ایک نیا ٹینک خریدا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے سارے جمع شدہ پیسے دفاعی فنڈ میں دے دیئے۔ اپنا سائیکل بھی فروخت کر کے رقم جمع کرا دی پورے ایک سو پچھتر روپے کا بکا تھا۔ اور جب ۱۹۷۱ء میں دشمن نے حملہ کیا تو اپنے دوستوں کو لے کر میں مستونگ پہنچا۔ ان دنوں کوئٹہ کراچی روڈ نہیں بنا تھا۔ ہم بسیں بدلتے کوئٹہ جا پہنچے۔ پوچھتے پچھاتے فوجی بھرتی کا دفتر ڈھونڈ نکالا۔ ہم نے ضد کی کہ ابھی اور اسی وقت ہمیں محاذ جنگ پہ بھجوایا جائے۔ ہم چولستان کے محاذ پر جانے کیلئے بضد تھے کیونکہ صحراؤں اور پہاڑی جنگجوؤں کیلئے ہم ہزاروں برس سے مشہور ہیں۔ کیپٹن نے بتلایا کہ فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم نے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ وہ گھبرا کے کرنل کے پاس چلا گیا۔ کرنل نے بلوا لیا۔ ہم سے گفتگو کی۔ ہمارا حوصلہ بڑھایا' ہماری بہادری کی تعریف کی۔ اس نے کیپٹن کو آگاہ کیا کہ براہوی پہاڑی اور

صحرائی جنگوں کے ماہر ہیں۔ چھاپہ مار حملوں سے دشمنوں کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ محض ایک روٹی اور تھوڑی سے گڑ پہ دو دن گزار سکتے ہیں۔ یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو کسی بھی لوجسٹک سپورٹ (Logistic Support) کے بغیر لڑ سکتی ہے۔ چونکہ میں قیادت کر رہا تھا کرنل نے ٹیبل پہ سجا قومی پرچم مجھے بہادری کے انعام میں دے دیا۔ ہم اپنا نام فوجی رجسٹر میں لکھوا کر خوش خوش لوٹ آئے کہ جلد ہی بلاوا آئے گا۔ مگر جنگ کا تو پانسہ ہی پلٹ چکا تھا۔ کشمیر جیتنے کا دعویٰ کرنے والے اپنا ہی آدھا ملک ہار بیٹھے۔ مگر جنگ کیلئے ہم تو تیار تھے تب سے یہ جھنڈا میرے پاس ہے۔ قومی پرچم کسی بھی قوم کی اخوت کا نشان ہے۔ ان کی پہچان ہے۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ گہرام کس قدر محبِ وطن انسان ہے۔ پھر موضوع بدلتے گئے۔

کھانے کے بعد میں بھی رخصت ہوا' اگلے روز صبح سویرے میں گھر چلا آیا۔ دور دور تک پیاز کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا میری واپسی یہ میدان صاف ہو گا۔ بیوپاری سارا مال لے جائیں گے۔ علاقے میں روپے کی ریل پیل ہو گی۔ کتنی تمنائیں پیاز کے ڈھیروں میں چھپی ہوئی تھیں۔ کرہ ارض کی بناوٹ جیسا پیاز کتنی دنیائیں آباد رکھتا ہے۔ گھر میں کچھ ایسا دل لگا کہ پلک جھپکتے پندرہ کیا بیس روز گزر گئے۔

میں واپس لوٹا تو حیران رہ گیا۔ گاؤں گاؤں قریہ قریہ پیاز بکھری پڑی ہے۔ ایک سڑاندسی اٹھ رہی ہے' بدبو کے بھبھاکے فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔ ہنستی کھیلتی بستی پہ عاشورہ اتر آیا تھا۔ شمر نے آبادیوں پہ قبضہ کر لیا تھا یزید نے تسلط قائم کر رکھا تھا۔

"یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے ہری چند!" میری عقل جواب دے چکی تھی۔

ہری چند کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ "پڑوسی ملک سے پیاز منگوالی گئی ہے' اتنی بڑی

مقدار میں اس قدر کم قیمت پر کہ کوئی بیوپاری ہمارا پیاز اٹھانے کیلئے تیار نہیں۔'' میں تلملا اٹھا۔''کون سا پڑوسی ملک؟''

ہری چند نے آنسو پونچھے۔''جس نے دوبار پہلے ہم پر حملہ کیا تھا۔اب وہ معاشی حملے کر رہا ہے۔ہمارا معاشی قتل عام ہو رہا ہے' ملک کے چند سیٹھوں کو البتہ فائدہ ہوا ہے۔'' میں بیدم ہو کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔مجھے یوں لگا یہ پیاز کے ڈھیر نہیں انسانی محنت اور عظمت کی قبریں ہیں۔ہو کا عالم طاری تھا۔سہمے سہمے مریض خوفزدہ انداز میں سلام کر کے معائنہ کرواتے' دوائی لیتے اور چپ چاپ گھر کی راہ لیتے۔وہ قحط کی چاپ سن رہے تھے قہقہے عنقا ہو چکے تھے محبتوں کے رنگ اجڑ چکے تھے' اگلے روز تصادم کا خدشہ بڑھ گیا۔ادھر مسلح کاشتکاروں نے ہائی وے بلاک کر دی' ادھر ٹرکوں میں اسلحہ سے لیس سپاہی چلے آئے۔ہم نے جلدی جلدی سفید اوورآل پہنے اور طبی امدادی سامان لے کر وہیں جا پہنچے۔ایک طرف مٹھی بھر کاشتکار تھے دوسری جانب کیل و کانٹے سے لیس سپاہی صف در صف۔دونوں جانب سینکڑوں گاڑیاں بلاک ہو چکی تھیں۔تصادم قریب تھا کہ گہرام چلا آیا۔اسے دیکھ کر مسلح کاشتکاروں نے نعرے بلند کیے اور زیادہ پُر جوش ہو گئے حالانکہ وہ نہتا تھا۔میں کچھ دور تھا' اس کی گفتگو نہ سن سکا۔وہ باآوازِ بلند بول رہا تھا۔کچھ ہنگامہ سا ہوا۔ایک آدھ ہوائی فائر ہوا۔احتجاجی نعرے بلند ہوئے مگر مجمع منتشر ہونے لگا۔

غربت کی دھوپ میں جلتے کسان بوجھل قدموں سے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے جہاں بھوک ان کا انتظار کر رہی تھی۔ہم نے بھی سفید اوورآل اتار دیئے جو محض اپنی پہچان کیلئے پہنے تھے۔کیونکہ میڈیکل سٹاف پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور ہم بھی واپس ہو لئے۔ہری چند آنسو پیتا میرے ساتھ چل رہا تھا۔سائے کچھ

طویل ہو گئے تھے' زہری گھٹ سے بادلوں کا دل نمودار ہو رہا تھا۔

''ڈاخکٹر ساب! مجھے یوں لگتا ہے ہم سب پیاز پکڑے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سب کچھ پیاز ہے۔چھلکے اتارتے چلے جاؤ تو اندر سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔چھلکے ہی چھلکے۔پردے ہی پردے۔پرت ہی پرت۔'' ہمارے قدموں سے سڑک کی گرم مٹی دھول میں منقلب ہوئی جاتی تھی۔میں چپ چاپ چلتا رہا۔چلتا رہا۔اسکول کچھ چٹیل سا اجڑا سا لگ رہا تھا۔میں نے اسکول کا بغور جائزہ لیا۔''اسے کیا ہو گیا ہے' ویران ویران سا کیوں لگ رہا ہے۔''

ہم نظریں ملائے بغیر چل رہے تھے' ہری چند کی آواز ویران کنویں سے ابھری۔

''گہرام نے جھنڈا اتار دیا ہے۔جو خود ہی اس نے سالوں پہلے لڑ جھگڑ کر لگایا تھا۔''

حاشیہ :-۱۔پیاز: پیاز ۲۔گہرام: بادلوں کا دیوتا

پرتھوی،غوری

برف زار وادیوں میں سناٹوں کا راج تھا۔ درخت لرز رہے تھے۔ ٹھٹھرتے درخت آنے والی رات کے تصور سے ہی کانپے جارہے تھے۔ رات قریب آرہی تھی، چپکے چپکے، دبے پاؤں۔ بے جان سورج ساری تپش کھو چکا تھا۔ یخ بستہ ہوائیں پناہ گاہوں کی تلاش میں تھیں۔ بار بار اس کھائی میں اتر آتیں، جہاں دونوں زخمی ایک دوسرے کو گھورے جارہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا خون منجمد سا ہونے لگا تھا۔ قیامت خیز سردی کے سبب زخموں سے خون صرف رس رہا تھا، جنہیں سرسری سا باندھا گیا تھا۔

نیم جان پرتھوی کی نگاہیں سرد ہوئی جارہی تھیں۔ اس نے پھر للکارا۔

''کچھ دیر میں میرے ساتھی آ پہنچیں گے، پھر قیدی بنا کر کسی جیل میں چھوڑ جاؤں گا۔ البتہ تمہارے رینک بطور یادگار ساتھ لے جاؤں گا۔ میرے ڈرائنگ روم میں سجے رہیں گے۔ تم کسی طور تو زندہ رہو گے''۔

غوری کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری بائیں کندھے میں۔ اس نے چٹان سے کمر لگا رکھی تھی، انگلی ٹریگر پر تھی اور جی

تھری کا رخ پرتھوی کی جانب تھا۔ وہ دونوں ہی برفانی طوفان میں بھٹک کر جانے کہاں سے کہاں آن پہنچے۔ دونوں ہی پوزیشن بدل بدل کر ایک دوسرے پر گولیاں برساتے رہے۔

چٹانوں کی آڑ سے، درختوں کے عقب سے، جھاڑیوں کی اوٹ سے، دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے چلے آرہے تھے۔ پرتھوی نے یہ تاثر دینے کی سعی کی کہ اس کے ساتھ دیگر حملہ آور بھی ہیں۔ غوری کو اندازہ ہوا تھا کہ دشمن کو ایک گولی تو ضرور لگی ہے۔ کیونکہ اس نے پرتھوی کو چٹان کی آڑ میں جھٹکا کھاتے دیکھا تھا، جیسے سخت کرنٹ لگا ہو۔ جیسے جھنجھنا سا گیا ہو۔ پرتھوی برف پر گرا اور چٹان کی آڑ میں کھسک گیا مگر پوزیشن بدل کر، برق رفتاری سے دائیں جانب کی چٹان پر نمودار ہوا اور فائر کھول دیا۔ غوری کٹے ہوئے درخت کی مانند برف پر آرہا۔ پرتھوی برف پر پھسلتا، قلابازیاں کھاتا، لڑھکتا ہوا غوری کے سر پر آ پہنچا۔ اسی لمحے غوری سنبھلا، اس نے بندوق سیدھی کرنی چاہی مگر پرتھوی کی بندوق اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان نشانہ لے چکی تھی۔ پرتھوی کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے عین سامنے بیٹھ کر پوزیشن لے رکھی تھی۔ خون اس کے ہونٹوں سے جھلک رہا تھا۔ غوری کے ہاتھوں میں بندوق ساکت ہوگئی۔ موت بیرل سے جھانک رہی تھی۔ غوری نے باآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ پرتھوی کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی چہرے پر زخموں کا اذیت ناک کھنچاؤ بھی تھا لیکن آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

''کیا یاد کرو گے، ایک بار اور پڑھ لو''۔

اس بار غوری کے ہونٹوں کو محض جنبش سی ہوئی۔ آخری لمحوں میں وہ دشمن کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔

"تم آنکھیں بند کر سکتے ہو، میں تین تک گن کر گولی چلاؤں گا۔"

غوری کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"میں موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر سپاہی کے دل میں اسی ایک لمحے کی تو آرزو ہوا کرتی ہے میں شہید ہو جاؤں گا۔ سبحان اللہ۔"

پرتھوی نے ہنسنے کی کوشش کی تو منہ سے خون ابل آیا۔

"اچھا! پھر تو تم خوش قسمت ہو، ایک، دو"۔

پرتھوی نے گنتی روک کر غوری کا چہرہ جانچا۔ غوری بدستور اسے گھورے جا رہا تھا۔

مگر گولی نہ چلائی۔ "میری مرضی ہے جب چاہوں گولی چلا دوں۔"

عین اسی لمحے غوری نے بندوق چھتالی۔ پرتھوی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھسکتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کی کمر چٹان سے جا لگی۔ غوری نے فائر نہ کیا۔ وہ بھی کھسک کر چٹان سے جا لگا۔ تقریباً بیس فٹ کے فاصلے سے، چٹانوں سے ٹیک لگائے وہ ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ سرد ہواؤں کا ڈریکولا ان کا خون چوس رہا تھا۔

"اس میگزین کے علاوہ بھی گولیاں ہیں، مگر میں تمہیں ماروں گا نہیں، قیدی بنا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارا نام اور رینک اور کس یونٹ کے ہو؟"

"رینک نہیں بتاؤں گا، میرا نام ہے پرتھوی راج چوہان"۔

"تمہیں یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی کہ میرا نام غوری ہے۔ محمد غوری"۔

پرتھوی نے اسے غضبناک نظروں میں لتاڑا۔ جیسے موقع پاتے ہی جھپٹ پڑے گا۔ "کئی سو برس پہلے میں نے تمہاری اچھی پٹائی لگائی تھی۔"

غوری کی آواز میں بھی دھمکی تھی۔ "بہتر ہوگا کہ اپنے زخم باندھ لو، مگر چالاکی نہ دکھانا، ورنہ!"

انہوں نے جیسے تیسے اپنے زخم باندھے۔ اس عرصہ میں بھی دونوں ایک دوسرے پر چیتوں کی مانند نظریں جمائے رہے۔ وقت کے سرد ریلے گزرتے جا رہے تھے۔ دونوں منجمد ہو رہے تھے، دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ۔ بے جان بے تمازت سورج۔ کھوکھلا سا لگ رہا تھا۔ جیسے ہر بوئی کا سورج۔

برفانی بادلوں کے دل کے دل اترے چلے آ رہے تھے۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ چوٹیوں کے درخت سرد ہواؤں سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔

دونوں اپنی اپنی پوزیشن میں مفلوج ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ چبھتی ہوئی کینہ توز نظریں، دلوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی ہوائیں دم سادھ لیتیں، پھر یکلخت درختوں سے الجھنے لگتیں۔ سورج کی نظریں ہٹنے کو تھیں۔ گہرے بادلوں کے سبب فضاء میں ملی جلی سی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ جیسے جھٹپٹے کا عالم ہو۔

"پرتھوی! تمہارے پاس ماچس ہوگی؟" غوری کا انداز جارحانہ تھا۔

پرتھوی نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ماچس نکالی اور پتھر کی طرح غوری کے منہ پر دے ماری۔ ہواؤں نے لپک کر غوری کی گود میں ماچس گرا دی۔

"ہمیں لکڑیاں بھی جمع کرنا ہوں گی۔ میرا ساتھ دو۔" غوری نے کہا۔

"اپنی مرضی سے کام کروں گا" پرتھوی نے قہر آلود نگاہ ڈالی اور پھر آس پاس سے لکڑیاں چننے لگا۔ لکڑیاں وہاں خاصی تھیں۔ مگر بہت گیلی تھیں، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر برف سے نکالنا پڑتا تھا۔ وہ دونوں زخموں سے چور تھے۔ ایک گولی پرتھوی کی

ٹانگ میں پیوست اور دوسری پھیپھڑے کو کترتی ہوئی کہیں سینے میں چھپ گئی تھی۔

دونوں گرتے پڑتے، برف پر گھسٹتے لکڑیاں جمع کرتے رہے۔ جھاڑیاں، ٹوٹی ہوئی شاخیں، شکستہ ٹہنیاں، رات بھر کا سامان جمع ہو گیا۔ غوری اپنی بندوق بیساکھی کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا مگر جا بکدستی سے سنبھل کر پرتھوی پر محتاط نظر ڈالی کہ حملہ نہ کر دے۔ غوری کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔ تیلیاں محدود تھیں۔ چند ایک تیلیاں جھلملا کر بجھ گئیں تو وہ متوحش ہو گئے۔

''مجھے دو ماچس!'' پرتھوی نے مطالبہ کیا۔

غوری نے ماچس اس کی جانب اچھال پھینکی۔ پرتھوی نے بمشکل تمام بٹوہ باہر نکالا۔ بٹوے میں سے نوٹ نکالے اور لکڑیوں کے نیچے بکھیر دیئے۔ شعلہ کوندا اور نوٹوں نے آگ پکڑ لی۔ ''تم اپنی جیب سے امریکن ڈالر نکالو۔ ڈالر کی محبت زیادہ ہو گئی ہے۔ مگر تمہیں زندہ بھی تو رہنا ہے۔'' پرتھوی نے تبصرہ کیا غوری نے نوٹ اور کچھ کاغذ جیبوں سے نکال کر پرتھوی کو دے دیئے۔ آگ کی حدت حاصل کرنے کیلئے وہ بہت قریب آ چکے تھے۔ جھاڑیوں پر پڑی لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ دھواں پھیلا اور تپش سی محسوس ہونے لگی۔ غوری کو معاً خیال آیا۔ اس نے بمشکل تمام جیکٹ کی جیب سے پلاسٹک کی بوتل نکالی اور سیاہی مائل سفوف لکڑیوں پر چٹکی بھر چھڑک دیا۔ آگ تیز ہو گئی۔ آگ کی زبان لپکنے لگی۔ موت کے سرد سفید قدم تھم سے گئے۔ وہ دونوں آگ کے اور قریب آ گئے۔ دونوں نیم جان ہو چکے تھے، کسی میں بھی حملے کی سکت نہ تھی، اس لئے الاؤ کے پاس وہ قدرے دوستانہ انداز میں آگ تاپتے رہے۔

پرتھوی کی گود میں خالی بٹوہ پڑا تھا، جس پر اس کی نظریں ٹھوکر کھانے لگتیں۔ کانپتی آگ میں بٹوہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

''نوٹوں کے جلنے کا افسوس ہو رہا ہے!'' غوری نے سوال کیا۔

''نہیں'' پرتھوی بولا تو اس کے ہونٹ خون میں بھیگ سے گئے۔

''اس میں میری بیٹی کی تصویر ہے۔ اپنی ماتا کی گود میں بیٹھی ہے''۔

پھر اس کی نظریں بیوی کے چہرے میں ڈوب گئیں۔

''موہ، شردھا، سیوا، پوجا، بھگتی اور بلیدان''۔

وہ اپنی بیوی سے ہمکلام ہوا۔ سے سسکیاں لینے لگا۔ رات سراسیمہ ہو گئی۔ الاؤ میں پرتھوی کی انا پگھلتی جا رہی تھی۔ دونوں کپتان لڑنے سے غافل ہو رہے تھے۔

''ہم جن نوٹوں کے لئے لڑتے ہیں، وہی ہم آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ انسان نوٹ چھاپتا ہے اور خود ہی ان پر بک جاتا ہے''۔

پرتھوی نے خود کلامی کے عالم میں تبصرہ کیا۔ غوری کے چہرے پر نیلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ اس نے تبصرہ کیا ''انسان دولت کے لئے نہیں عقیدے کی خاطر جان دیا کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ مضبوط ہوا کرتے ہیں جن کا کوئی عقیدہ ہو''۔

''میں بھی عقیدوں کیلئے لڑ رہا ہوں۔ کشمیر میرا ہے میں وطن کا محافظ ہوں''

پرتھوی کا مورال بلند تھا۔

موت دھیرے دھیرے اتری چلی آ رہی تھی۔ رات کے سائے میں دبے پاؤں جس کی دھمک ان کے چہروں پر محسوس ہو رہی تھی۔ سورج دم توڑ چکا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے دلوں میں ناامیدیاں براج رہی تھیں جو کبھی کبھی رینگتی رینگتی آنکھوں سے جھانکنے لگتیں۔

''پرتھوی! تم فائر کرو۔ شاید کوئی ہماری مدد کو پہنچ جائے''۔

''اگر بندوق میں گولی ہوتی تو تم پہ چلا دیتا مگر شاید نہ چلاتا زخمی دشمن پہ وار کرنا

راجپوتوں کی شان کے منافی ہے۔تم فائر کرو۔''

غوری متامل ہوا۔''جانے یہ علاقہ کس کا ہے ہمارا یا تمہارا۔ میں برف کے طوفان میں بھٹک گیا تھا۔CREVASSES سے بچتا ادھر نکل آیا تھا۔''

پرتھوی کا چہرہ بے جان ہوا جاتا تھا''تمہارا میرا تو زندہ لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ چند گھنٹوں میں سردی ہمارا خاتمہ کردے گی۔اگر ہمارا علاقہ ہوا تو میں تمہاری حفاظت کا وعدہ کرتا ہوں۔''

غوری نے کچھ دیر بعد کہا''میرا علاقہ بھی تو ہوسکتا ہے آ[illegible] زمیں کیا حرج ہے۔''غوری نے سوچا کہ کچھ دشمن بھی آئے تو مرتے مرتے انہیں بھی ساتھ ہی لیا جائے گا۔یہ سوچ کر اس نے بندوق کا بٹ زمین پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔دھماکے سے جنگل گونج اٹھا۔انگارہ آسمانوں کو چیرتا ہوا نکل گیا مگر پھر وہی جنگل کا شور۔ ڈائنیں بھیروں ناچ رہی تھیں۔یم دیوتا سیاہ لباس میں ہمالیہ سے اتر آیا تھا۔برفانی ہوائیں انہیں نوچ رہی تھیں۔رگ و پے میں نشتر چبھو رہی تھیں۔ہندہ کی طرح ان کا جگر چبا رہی تھیں۔آگ سلگ رہی تھی،لکڑیاں چیخ چیخ کر فریاد کر رہی تھیں۔

''غوری!میری بیٹی کو بتانا،اس کا باپ ایک دلیر انسان تھا۔اس[illegible] دلیری سے جان دی۔تم اس کے گواہ ہو''۔

پرتھوی آگ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا،جیسے وہ الاؤ کی حدت آنکھوں سے دل میں کشید کر لینا چاہتا ہو۔اس کا ذہن برفانی طوفان میں ڈوبتا جا رہا تھا۔یادداشت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔کبھی کبھی اس کے دانت بجنے لگتے۔

''میرے وطن کا مفاد میرا دھرم ہے''۔پرتھوی نے سکوت توڑا۔

''حکومت اور وطن میں فرق ہے''غوری نے تبصرہ کیا''تم وطن کے نہیں پرتھوی

حکومت کے وفادار ہو۔''ترائن کے میدان میں لڑی جانے والی جنگ جاری ہے سنجوگیتا کو پھر چتا پر بٹھانا چاہتے ہیں''۔

''غوری!میں خاصا زخمی ہوں،تم اپنی زبان سے بھی مجھے زخمی کرنا چاہتے ہو؟''

''ایسا نہیں ہے پرتھوی !اگر تم مجھے میرے گاؤں ملتے تو میں آؤ بھگت کرتا۔کسی ساحل پہ اکٹھے ہوتے تو تمہیں بڑھیا کھانا کھلاتا۔ہم ملے بھی کیسے۔''

غوری منجمد ہو رہا تھا۔''میرے ساتھ بھی یہی ہوا'میں بھی طوفان میں اپنا مورچہ ڈھونڈھ رہا تھا۔''

پرتھوی نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔''سگریٹ ہے تمہارے پاس؟''

دونوں نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگائے۔اب ان کے دانت بجنے لگے تھے۔

پرتھوی نے مزید لکڑیاں الاؤ میں جھونک دیں۔

اچانک برف باری ہونے لگی۔اندھیرا بڑھ گیا۔برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں نے ہواؤں کے لشکر وادیوں میں اتار دیئے۔الاؤ ٹمٹمایا،وقت تھم گیا۔ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔کتنے دن،کتنے ماہ،کتنے سال بھاگے چلے جا رہے تھے۔ان کی نگاہیں دم توڑتے ہوئے الاؤ پر تھیں۔امید کی کرن اسی اندھیرے میں جگمگا رہی تھی کہ رات بھر الاؤ جلتا رہے اور صبح دم انہیں مدد مل جائے۔امید کی حدت نے انہیں اب تک بچائے رکھا تھا لیکن ہر آنے والے لمحے میں ان کا خون سرد ہوا جا رہا تھا۔

ہواؤں کے دوش پر ہلکی اور باریک آوازیں ابھریں۔دونوں متوجہ ہو گئے۔پھر یہ آوازیں بلند اور گھمبیر ہونے لگیں۔ایسی وحشت ناک جیسے اندھیری رات ویرانوں میں روتی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہو جسے اس قیامت خیز سردی سے بچنے کی راہ نہ مل

رہی ہو۔

"پرتھوی! اندھیرا، ٹھنڈک، تنہائی اور نفرت انسانی روح کو کمزور کر دیتی ہے۔ آگ کو تیز کرو اور دل میں محبت پیدا کرو۔ ہم بھیڑیوں کے نرغے میں آ رہے ہیں"۔

پرتھوی نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی جس سے اس کے دانت بجنے لگے۔

"ایک خنجر چھپا رکھا تھا کہ تم نے گڑبڑ کی تو تمہیں پر آزماؤں گا۔ راجپوت کا دھرم ہے کہ لڑتا ہوا مارا جائے۔ میرے مرنے کے بعد یاد رکھنا کہ میں نے بھیڑیوں سے تمہاری جان بچائی تھی۔"

غوری نے گھرکی دی۔ "میری بندوق میں گولیاں ہیں ایک بھی نہ بچ پائے گا۔"

کشمیر کے برف زاروں میں رات پرے باندھے کھڑی تھی۔ زمین ویران اور سنسان تھی۔ اور گھراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔

آگ کی زبانوں نے لپکنا چھوڑ دیا تھا۔ الاؤ دم توڑ رہا تھا۔ کوئلوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ان دونوں کی زندگیاں آگ سے وابستہ تھیں۔ اور برف کا طوفان زناٹے سے چل رہا تھا۔ پرتھوی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے سورگباشی پتا جی انگریزی ادب کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انسانوں میں بھی ان بھیڑیوں کی روح گھس جاتی ہے۔ انسانی روح مغلوب ہو کر شکست کھا جاتی ہے۔"

غوری نے کمزور آواز میں تائید کی۔ "ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ ان عفریت صفت انسانوں کی شکلیں انسانوں جیسی ہی رہتی ہیں۔ دراصل وہ بھیڑیئے ہیں۔ لاطینی زبان میں سفید بھیڑیئے کو VULPUS کہتے ہیں۔ جس سے WOLF کا لفظ بنا اسی سے VULVA اور VAGINA بنا ہے۔ جنسی جنون' وحشی پن' حیوانیت' عقیدوں کا قتل انسانوں کو تفریق و تقسیم سے بانٹ بانٹ کر مارنا ان بھیڑیوں کا کام

ہے۔"

پرتھوی کی آواز گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی جس میں موت کا سیاہ پانی تھا

"انسان عقیدے کیلئے جان دیتا ہے۔ روپے پیسے کیلئے نہیں! جان بچانے کیلئے دولت قربان کر دیتا ہے۔ جیسے ہم نے نوٹ جلا دیئے۔" غوری نے چبھتا ہوا سوال کیا "کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم دونوں کے خون سے بھیڑیئے نکل گئے ہوں؟"

یکایک دور برف سے دبی جھاڑیوں میں ہل چل سی مچ گئی۔ یہ کھائی تین اطراف سے سیدھی چٹانوں نے بند کر رکھی تھی۔ صرف ایک تنگ سی دراڑ سے حملے کے امکانات تھے۔

غوری نے تگ ودو کے بعد بندوق سیدھی کر لی۔ اس کا جسم برف بن چکا تھا۔

جسم ذہن کے احکامات ماننے سے انکار کرتا جا رہا تھا۔ جسم باغی ہو رہا تھا۔

"شاید میرے ساتھی آ رہے ہیں غوری فائر نہ کرنا۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے تمہارا فوری علاج کرائیں گے۔"

غوری نے طنزیہ طور پر جواب دیا۔ "جنگی قیدی بن کر؟ ہرگز نہیں۔ ان میں سے ایک بھی نہ بچ پائے گا۔"

پھر جھاڑیوں کی اوٹ سے سرخ سرخ انگارے برآمد ہونے لگے جیسے بندوقوں کے فائر سے پیدا ہونے والے گول شعلے۔

انگارے جھاڑیوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ برف کے طوفان کے باوجود انگڑائیاں لینے' غرانے' اور پنجے گھسنے کی آوازیں آنے لگیں۔

جب انگارے سر پہ بھی آن پہنچے تو انہوں نے پہچانا بالمقابل برف کے ستائے ہوئے بھیڑیئے تھے۔ وہ نامختون تھے نہ وہ ہندو تھے نہ مسلمان ان کا دھرم بھوک مٹانا

تھا۔

دم توڑتی آگ سے یزداں رخصت ہوا جاتا تھا۔ بجھتے انگاروں کی دمک پرتھوی اور غوری کے چہروں پر سائے بن رہی تھی۔ بھیڑیوں کے دانتوں سے بھوک ٹپک رہی تھی۔ پرتھوی ان کی زد میں تھا۔ بچے تلے قدم اٹھاتے وہ پہلے پرتھوی کی جانب بڑھے۔

''گولی چلاؤ، فائر کرو''۔ پرتھوی پکارا۔

شست باندھے غوری ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ بھیڑیوں کی نقل و حرکت کے ساتھ ساتھ اس کی بندوق جنبش کر رہی تھی۔ مگر اس نے فائر روک رکھا تھا۔ سردی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی رہی۔

بھیڑیئے اب ایک جست کی دوری پر ہی رہ گئے تھے۔

پھر ایک مشترکہ غراہٹ کے ساتھ بھیڑیئے پرتھوی پر ٹوٹ پڑے۔ پرتھوی نے خنجر دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ جونہی بھیڑیا جھپٹا، پرتھوی نے خنجر دونوں ہاتھوں سے بھیڑیئے کے سینے میں اتار دیا، مگر بھیڑیئے کا وزن نہ سہار سکا اور بھیڑیئے سمیت زمین پر آ رہا۔ وہ بھیڑیئے کے نیچے دب گیا۔ فضاء میں بلند ہونے والے چار پانچ بھیڑیئے زمین پر گرنے سے پہلے ہی غوری کی گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ جنگل دھماکوں سے گونج اٹھا۔ چھ بھیڑیئے خون میں غلطان پڑے تھے، باقی غول چیختا چلاتا بھاگ نکلا۔ سنسان وادیوں کی جانب جہاں برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ غوری نے فائر میں تاخیر کی وجہ بتانا ضروری سمجھا۔ ''میں دراصل ان بھیڑیوں کو اپنے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ ان کے جسم گرم ہیں۔''

''کچھ دیر ہم اور بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔'' پرتھوی بھیڑیئے کے گرم خون اور جسم سے کچھ حدت محسوس کر رہا تھا۔

گرتے پڑتے، کراہتے، سنبھلتے جیسے تیسے خنجروں سے دو بھیڑیوں کی کھال نوچ کھینچ کر اتار ہی لی۔ اب VULPUS ہی انسانوں کے کام آ رہے تھے۔ باقی بھیڑیوں کو آس پاس رکھا۔ جسموں کو حدت پہنچانے کے لئے۔ زخموں کی پرواہ کئے بغیر ہی آپس میں لپٹ گئے کیونکہ الاؤ بجھ چکا تھا اور سردی خون میں اتری جا رہی تھی۔ خون آلود کھالیں انہوں نے گرم کمبلوں کی طرح اوڑھ لیں۔ کاٹتی، چیرتی، کچوکے لگاتی ہواؤں کا دباؤ کم پڑ گیا۔

''غوری! یہ لڑائی کب ختم ہو گی؟'' پرتھوی نے سوال کیا۔

''میری تمہاری!''

''نہیں پرتھوی اور غوری کی لڑائی جو صدیوں سے جاری ہے''۔

''جب VULPUS ہمارے حاکم نہیں رہیں گے۔'' غوری نے جواب دیا۔

دوسرے دن دونوں کے ساتھی ان کی تلاش میں تقریباً ایک ساتھ کھائی کے پاس آ پہنچے۔ انہوں نے سفید جھنڈے لہرا لہرا کر ایک دوسرے کو حملہ کرنے سے باز رکھا اور دونوں طرف کے کچھ لوگ اس کھائی میں اتر گئے۔ جو تین اطراف سے بند تھی۔ بھیڑیوں کی خون آلود کھالوں کے نیچے، خون میں ڈوبے ہوئے آپس میں لپٹے ہوئے دو انسان پڑے تھے، یخ بستہ۔ آپس میں لپٹے ہوئے، جنہیں کاٹے بناء الگ کرنا ناممکن تھا۔ مگر ان دونوں کا الگ الگ کیا جانا ضروری تھا کیونکہ ایک کو دفنانا تھا، دوسرے کو جلانا تھا۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ!!

پرندہ

بہرام نے جولی کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ''میرے خدا۔ کوئی اس قدر حسین بھی ہوسکتا ہے''۔ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ مضبوط دل کا مالک نہ ہوتا تو وہیں اس تجلی حسن سے خاک ہو جاتا۔ جولی کی آنکھیں تھیں کہ مدہوشی کا ساغر۔ چاند کی مانند وہ اپنی ہی روشنی میں ضوفشاں تھی۔ جولی کو دیکھتے ہی لوگ کلیجہ تھام کے رہ جاتے، گھائل ہوکر دیدہ دل فرش راہ کیے جاتے۔ جولی اپنے قاتل حسن اور جادوئی آنکھوں کے طلسم سے بالکل ہی غافل تھی۔ عام سی شلوار قمیص میں ملبوس، سر اور کندھے اونی چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس کا باپ پروفیسر البرٹ ایک غائب حاضر دماغ انسان تھا جو بلا سبب نظر کی عینک درست کرنے لگتا۔ نیلی واٹر پروف جیکٹ اور جینز میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں امریکی میر میز کے لمبے بوٹ تھے۔ انہیں کرائے پہ چند گاڑیاں اور چند سیکورٹی گارڈز حاصل کرنا تھے۔ بہرام فوراً ڈرائیور بن بیٹھا۔ اس کے بڑے بھائی باپ کی وفات کے بعد بہرام کا بہت ہی خیال رکھا کرتے بہرام ضدی اور سرپھرا نوجوان تھا۔ اس کی ہر ضد وہ پوری کر دیا کرتے بہرحال دونوں بھائی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ البرٹ نے ڈالرز میں ایک ماہ کی پیشگی ادائیگی بھی کر دی۔ اور یوں

بہرام جولی کا ڈرائیور بن کر اس قافلے کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ بہرام نے بی اے کرنے کے بعد ملازمت نہیں کی۔ آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولنے کی کوشش کرتا۔ وہ ان کا مترجم گائیڈ ڈرائیور اور منیجر تھا۔ البرٹ کے پاس مختلف نقشے تھے جن پہ اس نے کچھ علاقے سرخ دائروں میں نمایاں کر رکھے تھے۔ سبز اور نیلے دائرے بھی تھے۔ باپ بیٹی کے بارے میں افواہیں مشہور تھیں کہ وہ کسی قدیم خزانے کی تلاش میں ہیں۔ یا ریکوڈیک جیسا کوئی مقام ڈھونڈ رہے ہیں۔ جہاں سے سونا حاصل کرسکیں۔ بظاہر تو وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ سیٹلائیٹ میپ سے بھی مدد لیا کرتے۔ ان کے پاس بڑے چھوٹے جال۔ بے ہوش کرنے والی بندوق، ویڈیو کیمرے اور جانے کیا کچھ تھا۔ سب سے بڑھ کے ان کا جنون شوق کہ صحراؤں میں بھٹکتے پھرتے۔ گجر و گبریشہ۔ کرخ چکو۔ گڑوغان۔ دشت بڈو سے وہ توتک اور کوہ سرانی سرتک جانکلتے۔ کبھی وہ مار آپ کا سکی لوپ۔ جبیری کاریز اور درہجوری کی راہ لیتے۔ کبھی وڈھ۔ انجیرہ اور کوہ شاشان میں ڈیرے ڈال دیتے۔ گاڑیاں اور افرادی قوت بھی بہرام ہی کی کمپنی کی تھی۔ لہٰذا اسے بڑا آرام ملتا۔ باپ بیٹی انسان دوست اور عقیدوں والے سیاح تھے۔ اعلیٰ اخلاق، کم گو اور متواضع تھے۔ البرٹ ہر صبح اٹھ کر کاتھولک بائبل پڑھتا جس میں ناممکن کا لفظ نہیں ہے۔ دعائیں جانے کیا مانگتا بس وہ کامیابی کی خاطر محویت میں خدا سے باتیں ہی کرتا رہتا۔ جولی بھی ہر کھانے کے بعد مالک کا شکر ادا کرتی۔ پروفیسر شاہ خرچ انسان تھا۔ اس کا ہر ڈالر پچاسی روپے سے ضرب کھا جاتا۔ ناشتے کے بعد بہرام سٹیرنگ سنبھالتا۔ پروفیسر ساتھ کی سیٹ پہ آبیٹھتا عقب میں جولی ہوتی جو عقبی آئینے میں دکھائی بھی دینے لگتی۔ آخری متوازی سیٹوں پہ دو مسلح گارڈ براجمان ہوتے۔ اگرچہ البرٹ کا تعلق اٹلی سے تھا۔ مگر امریکیوں کے خلاف شدید نفرت کے باعث

انہیں اپنی سیکورٹی بھی کرنا پڑتی ۔ پچھلی گاڑیوں میں خورد و نوش کا سامان ، خیمے اور سیکورٹی گارڈز ہوتے ۔ البرٹ اور جولی کیمروں سے مختلف علاقوں کی تصویر بناتے ، چٹانوں کے جائزے لیتے ۔ پرندوں کو دوربینوں سے دیکھتے ۔ راہیں بدلتے رہے ۔ بظاہر تو یوں محسوس ہوتا عالم وحشت میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کر رہے ہیں ۔ سرشام خیمے نصب ہوتے الاؤ روشن ہوتا ۔ کھانا بنتا یہی وقت تھا جب جولی سے تنہائی میں گفتگو کا موقعہ ملتا ۔ پروفیسر وسیع المطالعہ انسان تھا ۔ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا ۔ کھانا کم کھاتا کافی پی کر بستر پہ ڈھیر ہو جایا کرتا ۔ سخت توہم پرست تھا ۔ دیومالائی کرداروں کو حقیقی سمجھتا ۔ حتیٰ کہ ڈریکولا کو بھی سچا سمجھتا ۔ جولی بھی کچھ مختلف نہ تھی ۔ ہالی وڈ کی سپر سٹار بننے کی بجائے وہ دشت صحرا میں سفر کی صعوبتیں برداشت کر رہی تھی ۔ جانے کس پُراسرار شے کی تلاش میں دونوں ہلکان ہو رہے تھے ۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بہرام سے بے تکلف ہو گئے ۔ جبکہ دیگر افراد انگریزی سے لاعلمی کے سبب خاموش ہی رہے ۔ کنکھیوں سے جولی کو دیکھ کر اس تابناک حسن کی کرنیں دل میں سمو لیا کرتے ۔ البرٹ کی گفتگو عقل و فہم سے بالاتر محسوس ہوا کرتی ۔ وہ نیک اور بدروحوں کے بارے میں سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہوئے ۔ صدیوں کی تاریخ کھنگال ڈال دیتا اور جب جولی اپنی دلکش آنکھیں بہرام کے دل میں اتار کے بولتی تو بہرام مسحور ہو کے رہ جاتا ۔ وہ ہاں میں ہاں ملائے چلا جاتا مبادا جولی گفتگو ختم کر کے خیمے میں چلی جائے ۔ جولی کا قرب ہی اس کی آرزو تھی ۔

''تم نے MERMAID کے بارے میں سنا ہوگا ۔ پرانی انگریزی میں MER سمندر کو کہتے تھے اور MAID کا مطلب ہے عورت ۔ یہ SIREN سے مختلف ہوا کرتی ہے ۔ تمہیں یقین ہے نا؟'' جولی نے سوال کیا ۔ بہرام نے فوراً ہی

اقرار کیا ۔ ''ہاں! کیونکہ ایک تو میرے سامنے ہی بیٹھی ہے'' ۔ پروفیسر کبھی کبھار مذاق کے موڈ میں بھی آ جاتا ۔ صبح سویرے بائبل پڑھتے ہوئے دیکھ کر ایک روز بہرام نے سوال کیا ۔ ''کچھ اس میں ہمارے علاقے کی جانب بھی اشارہ ملتا ہے ۔ آج کی بات بھی کچھ ہے'' ۔ پروفیسر صفحات الٹ کر یسعیاہ سے پڑھنے لگا ۔ ''اس کے نگہبان اندھے ہیں ۔ وہ سب جاہل ہیں ۔ وہ سب گونگے کتے ہیں ۔ جو بھونک نہیں سکتے ۔ وہ خواب دیکھنے والے ہیں ۔ جو پڑے رہتے ہیں ۔ اور اونگھتے رہنا پسند کرتے ہیں اور وہ لالچی کتے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے ۔'' بہرام ندامت سے مسکرایا ''ہماری پوری پارلیمنٹ کی تصویر کشی ہزاروں برس پہلے ہی گئی ۔ کمال ہے ۔''

بہرام کو تاسف بھی ہوتا کہ جولی اپنے دیوانے باپ کی ہم خیال کیوں ہے ۔ لیکن وہ ناقابل یقین باتوں پر غور کرنے کی بجائے جولی کو دیکھے چلا جاتا ۔ بہرام سوچا کرتا کیا یہ لڑکی کبھی آئینہ نہیں دیکھتی ؟ حسن کی یہ جیتی جاگتی دیوی بے آب و گیاہ پہاڑی سلسلوں میں کس شے کی متلاشی ہے ؟ ایک رات جب پروفیسر کب کا سو چکا تھا ، وادی میں سرد ہوائیں کوندر ہی تھیں ۔ ملازم الاؤ قائم رکھے ہوئے تھے ۔ الاؤ کے کانپتے لرزتے شعلے جولی کے چہرے کو ملکوتی بنا رہے تھے ۔ بکھرے ہوئے سیکورٹی گارڈز چٹانوں کے پیچھے پوزیشن لئے بیٹھے تھے ۔ بہرام کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا ، اس نے بیضاء تھام لیا ۔ ''جولی ! میں تم سے محبت کرتا'' اسے یقین تھا جولی شرمائے ہوئے خیمے میں چلی جائے گی ۔ مگر وہ اٹالین لڑکی مسکرا دی ''ہاں میں جانتی ہوں ۔ اور تم کوئی بڑے بااثر شخص ہو ۔ میری خاطر تم ڈرائیور بنے پھرتے ہو اتنی تکلیفیں برداشت کرتے ہو ۔'' بہرام پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ۔ جولی نے بات جاری رکھی ۔ ''ہمارے معاشرے میں تو قابل فخر بلکہ ناقابل یقین ہے کہ محبت میں کسی کی خاطر کوئی سب کچھ

تج بیٹھے اور لوگ تمہیں دیکھ کر مؤدب ہو جاتے ہیں۔ تمہارا ہر حکم بجا لاتے ہیں کون ہو تم؟'' بہرام بولا۔ ''تمہارا ایک ادنیٰ خادم'' بہرام نے محسوس کیا اس کے ہاتھ پہ جولی کی گرفت بھی مضبوط ہو گئی ہے۔ ''میں بھی تمہاری محبت سے محبت کرتی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ ایک دم بہت اچھے''۔ بہرام نے سکون کی سانس لی۔'' تم لوگ کیا تلاش کرتے گھوم پھر رہے ہو، سونا؟ کوئی خزانہ یا دفینہ؟'' جولی کھل کھلا کر ہنس دی۔ ''ہم ایک پرندہ تلاش کر رہے ہیں۔ گولڈن ایگل کی ایک خاص قسم۔ جو آدم خور ہے''۔ بہرام کی آنکھوں میں بے یقینی پا کر جولی نے تسلی دی۔ ''یقین کرو کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ صبح تمہیں تفصیل بتائیں گے۔'' جولی کے اقرار محبت سے بہرام بے حد مطمئن ہو گیا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا جولی کو تتلی والے فریم میں لگا دے اور دیکھتا ہی رہے مگر صبح کا انتظار ضروری ہو گیا تھا۔ ناشتے پر عقدہ وا ہوا۔ البرٹ نے گفتگو کا آغاز کیا'' ہم بظاہر ایک عام سا پرندہ تلاش کر رہے ہیں جسے گولڈن ایگل کہتے ہیں۔ کوہ ہمالیہ اور چین کے پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی مادہ نر سے زیادہ جسیم اور خونخوار ہوا کرتی ہے۔ گولڈن ایگل بلندی پر رہتا ہے۔ شمالی امریکہ۔ یوریشیاء۔ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی بعض قسمیں نقل مکانی بھی کرتی ہیں۔ خرگوش اور بھیڑ بکریاں اٹھا کے لے جاتا ہے۔ لیکن تمہارے علاقے میں تو انسانوں کو ہی اٹھا کر غائب کر دیتا ہے''۔ بہرام حیران سا سنتا رہا۔ ''مگر اتنا چھپانے کی کیا ضرورت ہے''۔ جولی نے مداخلت کی۔ ''اخفائے راز کا محض یہ سبب ہے کہ بعض جانور مختلف قوموں میں متبرک ہوتے ہیں۔ گائے۔ بندر۔ مکڑی وغیرہ! کہیں یہ تمہارے ہاں متبرک نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمارے دشمن بن جائیں۔ ہم تو یوں بھی غیر ملکی ہیں۔''

بہرام کو ان کی بات میں صداقت سی محسوس ہوئی۔ آئے دن لوگ غائب ہو رہے تھے۔ ان کے ورثاء احتجاج کرتے۔ دھرنے دیتے تو پھر پولیس ان پہ ٹوٹ پڑتی۔ گھروں میں رونے دھونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر پولیس کو ان آدم خور عقابوں سے بھلا کیا ہمدردی؟ وہ کیوں گولڈن ایگل کو تحفظ دیئے جا رہے تھے۔ بہرام نے اب انہیں مزید بے مقصد سفر سے روک دیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ گوربیچ سے بچنے کے لئے وہ ایک جھکی ہوئی چٹان کی پناہ میں آیا۔ وہ اس وقت چونکا جب جولی اس کے لئے کافی کا مگ لئے آ گئی۔ گھنٹہ بھر تو گزر چکا تھا۔ جولی مسکرائی۔ ''حضرت ابراہیم نے تو انسانی قربانی ختم کر دی تھی، تمہارے ہاں کیوں یہ رسم جاری ہے۔'' بہرام کے پاس جواز نہ تھا مگر اسے یوں لگا جیسے جولی نے اس کے سر پہ یخ پانی کی بالٹی انڈیل کر اسے جگا دیا ہو۔ اس روز وہ تینوں مختلف منصوبوں پر غور کرتے رہے حتیٰ کہ شام ہو گئی۔ الاؤ روشن ہوا۔ صحرا دن میں سوئے رہتے ہیں۔ مگر سر شام انگڑائی لے کے جاگ اٹھتے ہیں۔

بہرام کو احساس ہوا کہ تمام لوگوں کے دماغ سوئے ہوئے دشت ہیں۔ جہاں صرف گرداب ناچتے ہیں کیونکہ یکے بعد دیگرے لوگ غائب ہوئے جاتے ہیں۔ مگر گولڈن ایگل کو پکڑنے یا مارنے کی کوئی بھی تدبیر نہیں کرتے۔ ان غیر ملکیوں کے علاوہ کسی نے نشاندہی نہ کی صرف احتجاج ہی کرنے والے ہیں۔ زیادہ ہوا تو پرانے ٹائر جلا دیئے بھوک لگی تو روٹی کی تلاش میں اپنے گھروں کا رخ کیا جہاں غربت ان کا منہ چڑاتی ہے۔ یہ چڑیل بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہے۔ یا شاید ان کی ہم زاد ہے۔
اس رات نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ہواؤں کا شور تھا جن میں حشرات الارض کی نقل و حرکت اور آوازوں سے پُر اسرار CLAMOUR پیدا ہو رہا تھا۔

اس نے البرٹ اور جولی کو بتلایا کہ صدیوں سے مائیں اپنے شرارتی بچوں کو قابو کرنے کے لئے ڈراوا دیتی ہیں اندھیرے میں جھانک کر پکارتی ہیں۔ چک بر! داچناں ور (چک بر، یہ بچہ اٹھا کے لے جاؤ) حالانکہ کوئی ماں اپنا لخت جگر کسی چک بر کے حوالے نہیں کر سکتی۔ کیا حقیقتاً گولڈن ایگل ان آوازوں پہ چلے آئے ہیں۔ پدراک کے علاقے میں تین انسانوں کے جسم ملے تھے جنہیں ہوا سے گرایا گیا تھا۔ وہ دونوں دلچسپی سے بہرام کی باتیں سنتے رہے۔ البرٹ کو یقین تھا کہ گولڈن ایگل میں شیطانی طاقت ہے۔

''ہابیل کو خدا نے پسند فرمایا تھا اسے قابیل نے قتل ہی کر ڈالا۔ خدا کے پسندیدہ بندے ہزاروں برس سے مارے جا رہے ہیں گولڈن ایگل انہیں اٹھائے جا رہے ہیں۔'' بہرام نے سوال کیا۔ ''پروفیسر کیا تم دیومالائی کرداروں کو سچا سمجھتے ہو۔ ہمارے ہاں جیسے جاتو (چڑیل) پرکتو (پری) اچ نہار (اونٹ کی جسامت کا عفریت) ہیں یا ہزاروں برس سے ہم نے خود ہی انہیں تخلیق کر رکھا ہے۔'' البرٹ مسکرایا۔ ''سبھی زندہ ہیں، شکلیں بدل کر ہمارے معاشرے میں جیتے ہیں تم جانتے ہو شیطان کو موت نہیں یہ شیطانی طاقت والی EVIL SPIRITS ہیں، انسانی شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں۔''

بہرام کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا کیمپ بلندی پر ہے جہاں چٹانیں بھی ہیں۔ گولڈن ایگل کے شکار کے لئے اس سے بہتر جگہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہیں قیام کیا جائے۔ کیمپ میں ملازم اور دو گارڈ چھوڑ کر وہ چٹانوں میں گولڈن ایگل کھوجتے پھرتے رہے۔ بہرام کے پاس فلیم ہائیڈرو والی روسی کلاشنکوف تھی۔ تھک ہار کر سہ پہر میں اپنے کیمپ میں بہ خیریت لوٹ آئے۔ طوفانی ہواؤں نے انہیں بھی یخ بستہ کر دیا تھا۔ یہاں الاؤ کی حدت اور سامان خورد و نوش نے نئی طاقت دی۔

بہرام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کو کھلے میں اکیلا ہی بیٹھے گا تاکہ گولڈن ایگل اس پر حملہ کرتے ہوئے اٹھا کر لے جانا چاہے ایسے میں وہ فائر کھول دے گا، سیکورٹی گارڈ چٹانوں کے پاس چھپے رہیں گے وہ بھی گولڈن ایگل کو دائیں بائیں سے گھیر لیں گے۔ ممکن ہوا تو پروفیسر کے بڑے جال میں باندھ لیں گے۔ ورنہ مار ہی ڈالیں گے۔

رات کو وہ تینوں کافی پیتے رہے۔ الاؤ بھڑک رہا تھا۔ ''پروفیسر! گولڈن ایگل گویا سونے کا شاہین ہے۔ سونے اور بادشاہوں کا پرانا تعلق ہے۔ حکمرانوں کو سونا جمع کرنے کا جنوں ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنے طور پر سونا کسی کام نہیں آتا۔ یہ عقاب بادشاہوں کا حکمرانوں کا پالتو پرندہ تو نہیں ہے۔'' پروفیسر سوچ سمجھ کر جواب دینے کا عادی تھا۔ ''ہاں ایسا ممکن تو ہے۔ علامتی طور پر بھی اس کی خصوصیات بادشاہوں والی ہی ہیں۔''

پھر البرٹ سونے چلا گیا، جولی ان پاگل ہواؤں میں بہرام کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ ''تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔'' جولی کچھ ہراساں تھی۔ بہرام مسکرایا۔ ''کیا کروں ایک بڑے مقصد کے لئے محنت تو کرنا ہی ہوتی ہے۔'' ہوائیں ان جانی زبانوں میں رجز پڑھ رہی تھیں۔ ''جولی! اگر تم ان ہواؤں کو ڈانٹ دو تو شاید چپ ہی ہو جائیں''۔ اور جب رات ڈھلی سردی بڑھنے لگی تو بہرام نے بہ اصرار جولی کو خیمے میں بھجوا دیا۔ پھر وہ الاؤ کے پاس دوبارہ آ بیٹھا۔

ایک نیا پخنکست اتر آیا تھا۔ ہوائیں اجنبی زبانوں میں بہرام کو پیغام دے رہی تھیں۔

رات گئے گولیوں کی تڑتڑ سے وادی گونج اٹھی۔ البرٹ اور جولی گھبرا کر جاگ اٹھے خطرے کی پرواہ کیسے بغیر ہی وہ باہر دوڑ پڑے۔ برف آلود چاندنی میں جا بجا

خون کے دھبے تھے۔ دو ایک جگہ تو لہو کے تھالے سے بنے ہوئے تھے۔ جیسے بہت سے گولڈن ایگل زخمی ہو کر خون بہاتے ویران پہاڑوں میں جان بچانے کو اُڑ گئے ہوں۔ محافظ اندھیرے میں ان دیکھے عقابوں پر سنگل فائر کر رہے تھے۔ بہرام زخمی حالت میں دم توڑتے الاؤ کے پاس زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کلاشنکوف پر اس کی گرفت بدستور مضبوط تھی۔ جولی نے جھک کر بہرام کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ''بہرام بولو۔ میرے لئے آنکھیں کھولو، دیکھو تمہاری جولی ہے!'' جولی کی فریاد سے بہرام کا جسم کپکپایا اس نے آنکھیں کھولیں۔ لحظہ بھر کو زندگی ٹمٹمائی ''جولی وہ پرندہ نہیں ہے۔ وہ۔۔۔۔'' بہرام کی آواز ایک بار پھر ڈوب گئی۔ سانس اکھڑ گئی۔ جولی شدت غم سے آنسوؤں میں پگھل پڑی۔ ''گولڈن ایگل پرندہ نہیں ہے؟ تو وہ کیا ڈریکولا ہے۔ میری جان کی قسم بولو۔ بولو میرے لئے؟'' گرم آنسو بہرام کے چہرے پہ گرے تو بہرام کی کھلی آنکھوں میں آخری بار پہچان آئی۔ ''وہ پرندہ نہیں۔ وہ انسان ہے۔''

پاولی

بارنس اسکول سے گھر تک کا فاصلہ گرمیوں میں خاصہ طویل لگتا۔ عیدو اب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک سہمی ہوئی عید کے روز پیدا ہوا تھا۔ اسی نسبت سے نام تو عید محمد رکھا گیا۔ مگر سبھی پیار سے عیدو کہا کرتے۔ پانچویں جماعت یوں اہم تھی کہ عیدو کو وظیفہ لینا تھا۔ وہ بے حد محنت کرتا کیونکہ اسی جماعت میں کامیابی پر ماہانہ پانچ روپیہ وظیفہ آٹھویں جماعت تک ملا کرتا۔ عیدو کا باپ ایک سیاسی شخص تھا۔ یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتا۔ زیرز میں چھپنے والے اخبار بانٹتا پھرتا۔ عیدو کو روزانہ ایک ٹکا جیب خرچ کے لئے ملا کرتا۔ اور عید پر ایک پاولی۔ اسکول میں گھنے درخت تھے۔ جن کے نیچے پرائمری کلاسیں لگتیں۔ جبکہ مڈل کے لڑکے کمروں میں بیٹھتے۔ عیدو کے معلم نے متعدد بار بارنس پر تنقید بھی کی تھی۔ ستر برس قبل اسکول تعمیر کرتے ہوئے اس انگریز کو خیال کیوں نہ آیا کہ لوگ بھرن بھرن بچے پیدا کرتے ہیں۔ اتنے بچے بیٹھیں گے کہاں۔ درختوں کے نیچے طلباء پانی چھڑکتے اور ٹاٹ بچھا دیا کرتے۔ بہت سی جماعتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ پرائمری جماعتوں کو تو دو گھنٹہ پہلے ہی چھٹی دے دیا کرتے کیونکہ سورج سوا نیزے پہ آجایا کرتا۔ مگر پھر بھی طلباء بھوک

سے بیکل ہونے لگتے۔ درختوں سے ان پر بیر گرتے تو من وسلویٰ کی مانند اچک لیا کرتے۔ علم تو پیغمبروں کی میراث ہے۔ مگر خالی پیٹ میراث سمیٹنا دوبھر ہو جایا کرتا۔ عیدو گھر کے لئے ہم جماعتوں کے ہمراہ نکلتا۔ مگر حلوائی بازار سے اس کا راستہ دائیں جانب مڑ جایا کرتا۔ فرغانہ اسٹیشنری کے پہلو میں لگی سبیل سے پانی پی کر وہ پُر پیچ گلیوں میں داخل ہو جایا کرتا۔ پکی اینٹوں سے بنی تنگ گلیوں میں دھوپ کو رستہ بھی نہ ملتا۔ یہیں پہ لاھو کی دکان تھی۔ سات آٹھ برس قبل اسے آگ لگا دی گئی تھی۔ جس کے بعد لاھو نے کبھی دکان کو توجہ ہی نہ دی، بورڈ بھی شعلوں کی نذر ہو چکا تھا۔ کالے کالے داغ دھبے دیواروں پہ لگے ہوئے تھے۔ جیسے وقت کے پوسٹ ماسٹر نے زور زور سے کالی کالی مہریں ثبت کر رکھی ہوں۔ لاھو کا لاغر جسم سر کا وزن اٹھانے سے قاصر نظر آتا۔ اس کا چہرہ سوکھے چھواروں جیسا تھا۔ جو شادیوں اور قبرستانوں میں مفت بٹتے ہیں۔ لاھو اپنی بے جان آنکھوں سے شاذ ہی کسی کو دیکھتا۔ گاہکوں یا گلی سے گزرنے والوں کے چہروں پہ وہ نگاہ ہی نہ ڈالتا۔ لاھو کا وجود سیوی کی جھک اور تلی کے پھیلے ہوئے جنگلوں جیسا تھا۔ سائیں سائیں کرتا۔ خالی پلیٹ فارم جیسا۔ لاھو سردیوں میں اپنے بوسیدہ لباس پر ایک پرانی چادر کا اضافہ کر لیا کرتا۔ جبکہ گرمیوں میں نیکر اور بنیان میں چوکی پہ بیٹھا پسینے میں شرابور پکوڑے تلتا دکھائی دیتا۔ وہ ایک گم صم سا انسان تھا دشت سنٹ سر جیسا قلعہ گو جک جیسا۔ جب کبھی عیدو کے پاس ٹکا نہ ہوتا تو لاھو کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ زور سے سانسیں لے کر پکوڑوں کی خوشبو کشید کر لیا کرتا۔ یہی خوشبو دل میں بسا کے وہ گھر پہنچ جایا کرتا۔ اپنی کتابیں وہ ڈوری سے تختی کے ساتھ باندھ لیا کرتا۔ دھوپ میں یہی تختی چھاتہ بن جایا کرتی۔ عیدو کا والد بابو لشکری ایک سیاسی اور نظریاتی انسان تھا۔ خفیہ پولیس اس کے پیچھے لگی رہتی۔ میر غوث بخش بزنجو

نے اس کی ذہنی تربیت کی تھی۔ نال، جھاؤ اور جھالاوان کے دورے کرتا۔ اونٹوں پہ مارا مارا پھرتا۔ قلات اسمبلی کے باون ممبران میں تو شامل نہ ہو سکا۔ لیکن 14 دسمبر 1947 کو ہونے والے اجلاس بمقام ڈھاڈر میں ضرور شرکت کی تھی۔ ادھر میر غوث بخش بزنجو ہربوئی سے گرفتار ہوئے۔ 2 دسمبر 1948 کو انہیں دس برس قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ لاٹھی گولی کی حکومت کے باوجود 1955 میں غوث بخش بزنجو۔ شہزادہ عبدالکریم محمد حسن عنقا اور میر گل خان نصیر نے نئی سیاسی جماعت استمان گل قائم کر لی۔ بابو لشکری بھی پیش پیش رہا۔ اس کے بھائی کا کھوکھا صحبت خان کی سرائے کے ساتھ تھا۔ وہ بھی تنگدستی کا شکار رہتا مگر پھر بھی ماہ بہ ماہ عیدو کے ہاں خرچہ دے آیا کرتا۔ سیوی میں بجلی نہیں تھی۔ عام بچوں کی مانند عیدو کو بھی لالٹین کی روشنی میں پڑھنا پڑتا۔ کیونکہ اسے وظیفہ تو کسی طور لینا ہی تھا۔ بابو شکری سیوی کے دیہاتوں میں اپنے خستہ حال سائیکل پہ جا نکلا۔ نوجوانوں سے رابطے قائم کرتا۔ پمفلٹ تقسیم کرتا پٹونگ میں روٹی باندھ کر لے جایا کرتا۔ جہاں کہیں بھوک ستاتی گڑ اور روٹی کھا کر آگے روانہ ہو جایا کرتا۔ البتہ سردیوں کے موسم میں سائیکل پہ کلہاڑی ساتھ رکھ لیا کرتا۔ تاکہ خون آشام بھیڑیوں سے مامون رہے۔ وہ دو ٹانگوں والے باوردی بھیڑیوں سے لڑتا چلا آ رہا تھا۔ اب اسے دو یا چار ٹانگوں والا ظالم خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگلے ہی برس استمان گل کو پاکستان نیشنل پارٹی میں ضم کر دیا گیا۔ دیگر رفقاء کے ہمراہ وہ جی ایم سید۔ عبدالغفار خان اور عبدالصمد خان اچکزئی سے ملتا رہا۔ جن کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1957 میں وہ اس نئی پارٹی کے لئے کام کرنے لگا۔ ادھر عیدو کا امتحان قریب آ رہا تھا۔ مگر وہ عیدو کو وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اور نہ ہی پیسہ۔ کبھی وہ سردار عطا اللہ مینگل کے پاس وڈھ چلا جایا کرتا۔ کبھی بنگلزئی سردار کو ملنے اسپلنجی

جانکلتا۔ اونٹوں پہ سائیکل پر اور کبھی پیدل وہ جھالاوان اور ساراوان میں مارا مارا پھرتا۔ ایسے میں عیدو اس ٹکے سے بھی محروم رہتا جو بابا اسے اسکول جاتے ہوئے دیا کرتا۔ ون یونٹ کے بعد بلوچستان کا نام بدل کر کوئٹہ قلات ڈویژن رکھ دیا گیا تھا۔ بلوچوں کو بلوچستان کہنے کی اجازت نہ تھی۔ بلوچستان کہنے والا وہیں دھر لیا جاتا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ مشہور تھا کہ جنرل ایوب پھانسی سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔ منہ اندھیرے کسی کو مٹرگشت کرتے پکڑا گیا تو وہیں گولی ماردی جائے گی۔ ہاں کندھے پہ بیلچہ یا کدال ہو تو تصور کیا جائے گا کہ کام پہ نکلا ہے۔ لشکری کے ہاں خفیہ اجلاس بھی ہوا کرتے۔ چٹائیوں پہ بیٹھے کارکن بھی جوش خطابت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔

''ریاست کا نام ہی غلط ہے، اسلامی جمہوریہ! کبھی اسلامی ریاست کا سربراہ غیر مسلم نہیں ہوسکتا۔ جبکہ جمہوریہ میں زیادہ ووٹ لے کر ہندو۔ سکھ۔ مسیحی بھی صدر ہو سکتے ہیں۔''

کوئی غصے میں چلا اٹھتا۔ ''نوشکی یادابندین سے محض روٹ پرمٹ لینے کے لئے لاہور جانا پڑتا ہے۔ ایف اے کا رول نمبر نہ آئے تو لاہور جانا پڑتا ہے۔ یہ کیسا ون یونٹ ہے۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔'' محرومی کے زخموں کا اندمال ممکن نظر نہ آتا۔ چونکہ اخبار شائع کرنے۔ بیچنے اور پڑھانے پہ حکومتی قدغن تھی۔ سب کچھ انڈر گراؤنڈ ہوتا۔ کراچی سے اخبار چھپواتے خفیہ طور پر لا کر اسی چھپا چھپی میں تقسیم کر دیا کرتے۔ عیدو دوڑ کر ساقی ہوٹل سے بہت سی روٹیاں لے آتا اور لپک کر لاھو سے پکوڑے بندھوا لاتا۔ لاھو کسی زندہ لاش کی مانند سست رفتاری سے یہ کام کر دیا کرتا۔ ردی کاغذوں میں پکوڑے باندھتے ہوئے بھی اس کے تاثرات نہ ابھرنے پاتے۔ کچھ کارکن تو روٹی کھا کے یکے بعد دیگرے غائب ہو جایا کرتے باقی کالی چائے پی

پگڑیوں کے تکیے بنا پاؤں پسارے چٹائی پہ سو رہتے۔ وہ سب مل کر نت نئے منصوبے بناتے روزگار لانے کے، حقوق حاصل کرنے کے اور باعزت شہری بن کے زندہ رہنے کے۔ ان کے حاکم چائے کی پتی کی طرح امپورٹیڈ تھے۔ زبان۔ ثقافت اور تاریخ سے لاعلم۔ جو اب تک ہندوستان کے بادشاہوں کی تاریخ پڑھائے جا رہے تھے۔ اور درس نظامی بھی جو چھ سو برس قبل نظام الملک طوسی نے وضع کیا تھا۔ حکمران پیر تسمہ پا کی مانند کندھوں پہ سوار تھے۔ آئین بننے بھی نہ دیتے۔ عیدو لالٹین جلائے دیر تک پڑھتا رہتا۔ تختی لکھ لکھ مٹاتا رہتا۔ خوش خطی کر کے بابا کو دکھاتا۔ لشکری نوک پلک درست کر کے تختی لوٹایا کرتا۔ حساب، جغرافیہ، دینیات غرضیکہ تمام مضامین میں محنت ہو رہی تھی۔ بابا اسے بلاناغہ املا دیتا۔ انگریزی زبان چونکہ آٹھویں سے پڑھائی جاتی فی الوقت اس کی ضرورت نہ تھی۔ بابا اپنے دوستوں سے بھی تاکیداً کہتا کہ عیدو سے سوالات کریں۔ املا دیں تاکہ بچے کی جھجک دور ہو۔ محض درسی کتابوں تک محدود نہ رہے۔ پھر وہ خود ہی غلطیوں کی نشاندہی کرتا۔ عیدو سے سوالات بھی حل کرواتا۔ اسے ایک اکنی یا ایک شاہی انعام میں ملا کرتی۔ لیکن جب بابا سیاسی مہم پہ نکلتا تو گھر میں سناٹا چھا جاتا۔ لاھو کے پڑوس میں واقع مندر جیسا سناٹا جہاں اکیلا بھگوان کیواڑ بند کیے دن رات بیٹھا رہتا تھا۔ آگ برساتی ہواؤں میں بھی عیدو کتاب نہ چھوڑتا۔ دادی اس کے لئے ہمہ وقت جھلی کی رسی تھامے غنودگی کے عالم میں جھلی چلاتی رہتی اور عیدو پہلو کے بل لیٹے سبق ازبر کرتا رہتا صبح کے وقت بہشتی پانی لئے آتا۔ پھر مہترانی آتی۔ اس کے بعد گھر میں کوئی بھی نہ آتا۔ سوائے ان چھپکلیوں کے جو دیواروں یا چھت کی بلیوں سے لپٹ جایا کرتیں۔ کھانا بھی نہ طلب کرتیں۔ بس گھورتے گھورتے چلی جایا کرتیں۔ راتوں میں استار کی مانند دادی کی آنکھیں چمک جایا کرتیں۔ وہ ئیئ

لگائے اپنے بیٹے کے بارے میں سوچتے ہوئے بی بی نانی سے دعائیں مانگا کرتیں کہ اس کا بیٹا حکومتی تشدد سے محفوظ رہے۔

نیشنل عوامی پارٹی نے جلوس نکلانے کی تیاری کی تو بہت سے کارکن لشکری کے ہاں بھی آرہے۔ گھروں میں پانی کے نل نہ تھے۔ شدید گرمی میں سیوی کا درجہ حرارت پچاس ڈگری سے تجاوز کر جاتا مگر پورے سیوی میں بجلی نہ تھی۔ طبی سہولیات نہ تھیں۔ خصوصاً خواتین کے لئے علاج کروانا انتہائی دشوار تھا۔ دردمند لواحقین مختلف مزاروں سے خوردہ لاکر اپنے بیماروں کو چٹایا کرتے۔ مظاہرین نے محض اپنے مطالبات رجسٹر کروانے تھے۔ حکام سے ملاقات کرنا تھی۔ مگر پولیس درمیان میں حائل ہوگئی۔ پر امن مظاہرین سے تکرار بڑھی تو لاٹھی چارج کر دیا۔ مظاہرین نہتے تھے انہوں نے بھی آس پاس جو کچھ ملا اٹھا کر پولیس کی پٹائی شروع کر دی۔ بابا زخمی ہو کر لوٹا تو عیدو تڑپ اٹھا۔

دوڑ کر صندوق سے ریوالور نکال لایا۔ ''کس نے مارا ہے تم کو بابا''۔ وہ گولیاں برسا کر باپ کا بدلہ لینے پر تلا ہوا تھا۔ ''اس نظام نے مجھے مارا ہے۔ چھوڑ دو ریوالور وہیں رکھ دو۔ اس کا مقابلہ علم سے ہوگا۔ تعلیم سے ہوگا۔ گاندھی، جناح، نہرو نے بھی انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزوں سے تعلیم حاصل کر کے پھر ان سے لڑے تھے۔ ہسپتال جانے میں گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ زخمی کارکن ادھر ادھر چھپ رہے۔ دھجیاں کاٹ کر گھر میں ہی لشکری کی مرہم پٹی کر دی گئی۔ تین کارکن ان کی بیٹھک میں زخمی پڑے تھے۔ پٹیاں بندھی تھیں۔ دادی نے مرہم بھجوادی تھی۔ دودھ میں ہلدی ملا کر گرم دودھ عیدو کے ہاتھ بھجوایا۔ زخمیوں کے حوصلے بلند تھے۔ جسم مجروح تھے۔ مگر چہک رہے تھے۔

''کوئی دیکھے تو ہمیں سرخے سمجھے ہم بھی خون میں لال لال ہیں''۔ ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

''کمیونسٹ کو سرخا کہتے ہیں''۔ بابا نے سمجھایا۔ ''جاؤ عیدو تختی لاؤ''۔ عیدو تختی دوات لایا تو لشکری نے زخمی ہاتھ سے انگریزی میں لکھا A LONG DUEL اور عیدو کو یاد کرایا۔ ''بار بار لکھنا۔ ہمارے اور آمروں کے درمیان ایک طویل جنگ ہو گی۔ جس میں جیت ہماری رہے گی''۔

سرِشام دروازے پہ دستک ہوئی۔ باہر رمضانی کھڑا تھا۔ ''میر ساب کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ نصیب دشمناں کچھ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟'' ہدایت کے مطابق عیدو نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔ ''بابا گھر نہیں آئے''۔

رمضانی چھاجارہا تھا۔ ''میری تو جان بھی حاضر ہے ان کے لئے۔ عیدو بس بابا سے کہہ کر ایک دکان الاٹ کروا دو۔ دھوپ گرمی میں خوانچہ لگاتے بے حال ہو چکا ہوں''۔

''کہہ دوں گا'' عیدو نے مختصر جواب دیتے ہوئے کیواڑ بند کر دیئے۔ رمضانی چاٹ کا خوانچہ لگاتا تھا سالانہ میلہ مویشیاں میں خاصہ کما لیا کرتا۔ جبکہ عام دنوں میں سیوی کے گلی کوچوں میں آوازیں لگاتا پھرتا ''چاٹ والا، چنا جور گرم'' آواز اچھی تھی۔ گیت کی طرز پہ گاہکوں کو متوجہ کیا کرتا۔ لٹ لٹا کر بھارت سے آیا تھا۔ سبھی کو اس سے ہمدردی تھی۔ عمر کوئی پچیس برس کے لگ بھگ تھی، سیاہ رنگت ناٹا قد پھولے پھولے گال جو داڑھی کے باعث زیادہ ابھرے ہوئے محسوس ہوتے۔ بائیں ابرو پہ کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ جو دھوپ میں قدرے متورم ہو جایا کرتا۔

رات میں جب مہمان چائے پی کے سو رہے تو عیدو نے سبق کا اعادہ شروع کر

دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر دھواں اگلتے دخانی انجن مال بردار ڈبوں کو آپس میں جوڑتے پھر رہے تھے۔ ان کے باہم ٹکرانے سے پیدا ہونے والی دھمک تیرتی ہوئی گھر میں داخل ہو جاتی۔ لالٹین کی زرد کانپتی ہوئی روشنی مٹی کے تیل میں بھیگ سی گئی تھی۔ معاً گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز قریب آئی۔ تانگہ عین گھر کے سامنے رکا۔ کوئی کود کر تانگے سے اترا اور دروازہ پیٹنے لگا۔ دادی بھی متوحش ہو کر جاگ اٹھی۔

''میں ہوں سپاہی جمعہ خان سر پہ دروازہ کھولو''۔

زخموں سے چور لشکری ڈگمگاتا ہوا باہر نکلا۔ دونوں نے معانقہ کیا۔ جمعہ خان عجلت میں تھا۔ اسی تانگے میں نکل چلو گرفتاری کا حکم آیا ہے۔ جلدی کرو۔'' لشکری نے گھائل ساتھیوں کو بیدار کیا گھر والوں کو خدا حافظ کہا'' ہم ایسی سمت نکلیں گے کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو۔ ہرنائی کی ریل گاڑی میں ناکس یا شاہرگ سے ڈمیارہ کے راستے زیارت چلے جائیں گے۔ یا پھر زرد آلو کے راستے کچھ جا نکلیں گے۔'' لشکری نے عیدو کو موری والے بہت سے تانبے کے پیسے دیئے۔'' پکوڑے کھاتے رہنا۔ خوب دل لگا کر پڑھنا۔ اور ہاں گھر کا خیال رکھنا''۔ جب بھک بھک کرتا دھواں اور بھاپ اگلتا انجن دیپال سے بھی آگے نکل گیا تو انہیں مانتے ہی بن پڑی کہ لشکری خیریت سے ہمراہیوں کے ساتھ بہت دور جا رہا ہے۔ شاید وہ مخالف سمت میں چکر کاٹتے ہوئے کچلاک کے راستے نواب رئیسانی کے پاس کانک جا رہے تھے۔

اسکول سے واپسی پہ عیدو نے چار پیسے کے پکوڑے خریدے اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا گھر کی جانب گامزن ہوا۔ راہ میں رمضانی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ پھر دکان کی رٹ لگانے لگا۔'' میرے بابا کے پاس اپنے لئے بھی دکان نہیں تمہیں کیا دلوائے گا''۔ رمضانی مصر رہا۔'' عیدو بیٹا! تمہارا بابا چاہے تو سیوی میں ہڑتال ہو جائے۔ اس کی

ایک آواز پر درہ بولان جام ہو جائے۔ یہ پکوڑے وکوڑے چھوڑو۔ چاٹ کھایا کرو۔ دیکھو گھوڑے چنے کھاتے ہیں۔ آٹھ آٹھ سواریاں لے کر تانگے اڑائے لے جاتے ہیں۔ چنے میں بڑی طاقت ہے ورنہ تو گھوڑے والے اور تانگہ بان انہیں پکوڑے کھلاتے۔ ہندو پکوڑے کی بجائے مسلم چاٹ کھایا کرو۔ ایمان بھی تازہ رہے گا۔''

جانے کس نے راہ دکھائی تھی کہ رمضانی ہر دوسرے تیسرے روز گھر پہ آدھمکتا۔ لشکری کی خیریت دریافت کرتا اور پھر گھوم پھر کر دکان کا مطالبہ کرنے لگتا۔ متعدد بار اس نے سجا بنا کر چاٹ کی تھالی پیش کی۔ عیدو نے کبھی قبول نہ کی۔ اسے رمغانی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بڑا چرب زبان تھا۔ یوں زبان چلاتا جیسے گھوڑے کی ٹاپیں جیسے ایک بگٹٹ گھوڑا سنگریزوں پہ خالی تانگہ لئے جا رہا ہو۔

ایک روز آسمان ابر آلود تھا۔ اہل سیوی کے لئے بادل اور بارش نوید زندگی لاتے۔ عیدو اسکول سے لوٹا تو اسے تعجب ہوا کہ رمضانی نے خوانچہ لاھو کی دکان کے مقابل تھڑے پہ لگا رکھا ہے۔ صاحب خانہ نے انسانی ہمدردی کے تحت یہ سائبان والی جگہ اسے دی تھی۔ لاھو نے حسب معمول نگہ اٹھا کے بھی نہ دیکھا کہ کاروباری رقیب قلب میں آن بیٹھا ہے۔ رمضانی نے عیدو سے لشکری کے بارے میں سوال کرنا چاہا مگر عیدو پکوڑے لے کر بے اعتنائی سے مختصر جواب دے کر آگے بڑھ گیا۔ اگلے روز پیسے ختم ہو چکے تھے وہ سر اٹھائے لاتعلقی سے گزر گیا۔ رمضانی کی آواز نے پیچھا کیا۔ '' پکوڑے نہیں خریدو گے؟'' عیدو نے تنک کر جواب دیا ''نہیں'' رمضانی نے پیار سے صدا دی'' عیدو بیٹا! اپنی چونی تو اٹھا لو تمہاری چونی گر گئی ہے۔'' عیدو نے پلٹ کر دیکھا زمین پہ پاولی پڑی تھی۔ عیدو کا حلق خشک ہو گیا۔ بھوک کچھ اور بڑھ گئی۔'' یہ میری پاولی نہیں ہے''۔ رمضانی سرد لہجے بولا۔'' میری بھی نہیں تم ہی اسے اٹھا لو۔

تمہاری ہی ہوگی۔ ورنہ کوئی اور اٹھا لے گا۔'' عیدو کی نگاہیں پاولی پہ جم گئیں۔ جوائینوں والے غیر مسطح فرش سے اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ وہ پاولی اٹھانے کو جھکا مگر ٹھٹک سا گیا۔ اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی نگاہیں پاولی سے ہٹائیں۔ دور سے کچھ لوگ گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ پکوڑوں کی خوشبوؤں کا ریلا لاھو کی دکان سے نکلا جیسے کرتہ کی سرکش ہوائیں۔ آنتیں بھوک سے کٹنے لگیں۔ عیدو نے دائیں بائیں دیکھا اور پاولی جھک کر اٹھالی۔ مٹھی میں آتے ہی پاولی انگارہ بن گئی۔ جو جلدی سے اس نے لاھو کے تھال پہ رکھ دی۔ ایک ٹکے کے پکوڑے لئے اور ساڑھے تین آنے جیب میں ڈال کر باہر نکلا۔ اس نے مجوب سی نظر رمضانی پہ ڈالی جو سر جھکائے پیاز کتر رہا تھا۔ ساڑھے تین آنوں میں وہ حدت نہیں تھی۔ نہ ہی انہوں نے ہتھیلی جلائی۔

لاھو تو تہواروں پہ بھی دکان بند نہ کیا کرتا۔ مگر اب اس کی دکان بند رہنے لگی تھی۔ اس نے لڑکوں سے سنا کہ لاھو ملک کا دشمن تھا۔ اس کی دکان میں سے جعلی روپے برآمد ہوئے۔ جو چاندی کی بجائے بھرت کے تھے۔ اور نقلی پاولیوں کا تو حساب ہی کیا۔ عیدو سہم گیا۔ زندگی ہر طرح امیرہ چاہ اور واشپ چشمہ بن گئی تھی۔ اداس اداس دخانی انجن سٹیاں مارتے سیوی آتے اور سسکیاں بھرتے پٹ میں نکل جاتے۔ اندیشہ تھا کہ لشکری پر دباؤ ڈالنے کے لئے عیدو کو حکومت گرفتار کرے گی۔ کیونکہ ملک عبدالعلی خان کاکڑ کا گیارہ سالہ بیٹا بھی کچلاک سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ عیدو کے ماموں اسے کتابوں تختی سمیت بادرہ لے گئے تھے۔ تاکہ لوہانی یا پھر گزینی قبائل کی سرداری میں دے دیا جائے۔ یہ جان کر اپنے بیٹے کا مستقبل بچانے کے لئے لشکری نے سیوی پہنچ کر خود ہی گرفتاری دے دی۔ عیدو کا امتحان سر پہ تھا جب وہ سیوی لوٹا۔ اس کی تیاری بھی

مکمل تھی۔ گھر میں ماں۔ دادی اور غربت نے استقبال کیا۔ بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ اگلی صبح بستہ اٹھا کر عیدو اسکول چلا تو اسے یہ دیکھ کر انجانی سے خوشی ہوئی کہ گلی پکوڑوں کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے قدم تیز ہو گئے مگر پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔ کڑاہی ویسی ہی سیاہ تھی آگ ویسے ہی زبانیں نکال رہی تھی۔ مگر پکوڑوں والے تھال کے پیچھے چوکی پر رمضانی بیٹھا تھا۔ عیدو نے اوپر دیکھا بورڈ پر بھدی تحریر میں سبز روغن سے مرقوم تھا۔ ''مسلم پکوڑا ہاؤس'' عیدو نے جیب سے ساڑھے تین آنے کی رقم نکال کر گلی میں پھینک دی اور آگے بڑھ گیا۔

امیرہ چاہ: زہریلے پانی کا کنواں

واشپ چشمہ: معدنیات کے باعث مضر صحت پانی کا چشمہ

عیدی

زیارت پوسٹ آفس میں کچھ زیادہ کام نہ تھا۔ 1906 میں جب انگریزوں نے یہ دفتر قائم کیا تو مورس لائن کے ذریعے کلکتہ اور دہلی سے اس کے روابط تھے۔ عملہ دس افراد پر مشتمل تھا۔ مگر رفتہ رفتہ زیارت کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ ایک سب پوسٹ ماسٹر، ایک پیکر اور دو پوسٹ مین رہ گئے۔ ایک ڈاکیا زیارت میں ڈاک تقسیم کرتا۔ کبھی کبھار ایک آدھ منی آرڈر بھی آ جایا کرتا۔ ویلج پوسٹ مین ہر روز ایک گاؤں میں ڈاک تقسیم کرنے کا پابند تھا۔ ڈاک چونکہ تھی ہی نہیں۔ وہ مہینہ میں ایک بار خانہ پُری کے لئے ان علاقوں میں جا نکلتا۔ ایک آدھ خط تھما ہی دیا کرتا۔ کوئی خط لکھواتا اور روپیہ دے کر چلا جاتا۔ پھر وہ تاکید کرتا کہ ڈاکخانے سے لفافے میں ڈال کر پوسٹ کر دے۔ ماہانہ دورہ مالی طور پر مفید رہتا۔ ہر گاؤں میں کھانا ملتا، چائے ملتی۔ کچھ لانڈی مل جاتی۔ بعض قدردان کرت دے دیا کرتے۔ ویلج پوسٹ مین غفار نے زیارت ڈاکخانے کے ساتھ ہی سگریٹ کا کھوکھا لگا لیا تھا۔ سب پوسٹ ماسٹر نور کو وہ ایک آدھ ڈبیہ مفت میں دیا کرتا ایک دو بوتل مٹی کا تیل بھی اسٹوو کے لئے اس کے گھر بھیج دیا

کرتا۔ نور کوئی تعرض نہ کرتا۔ البتہ بیگار کے طور پر کبھی کبھار ذاتی کام بھی لیا کرتا۔ سردیوں میں تو سرکاری ملازم غائب ہی ہو جایا کرتے۔ ڈاک کا سلسلہ بھی رک جایا کرتا۔ غفار نے چینی پتی لے جا کر دیکھا دیہاتوں کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لے لیا کرتے۔ ڈاک کے ساتھ اس نے یہ اضافی کاروبار بھی شروع کر دیا جو خاصہ فائدہ مند رہا۔ پوسٹ ماسٹر نور نے بھی ڈاکخانے میں ہی پبلک کال آفس کھول لیا۔ ذاتی طور پر وائرلیس فون لیا۔ اپنے کارڈ ڈال کر لوگوں کی کالیں ملایا کرتا۔ زیارت کے پہاڑی سلسلوں میں موبائل کام ہی نہ کرتا۔ سبھی فون کرنے نور کے پاس چلے آتے۔ یوں بڑی رونق سی لگی رہتی۔ ورنہ تو ڈاک بالکل ہی ختم ہوتی جاتی تھی۔ یوں لگتا لوگوں نے خط لکھنے چھوڑ دیئے۔ ڈمیارہ کا ایک معمر شخص قاسم صنوبر کے جنگلوں میں اکیلا ہی رہا کرتا۔ وہ ایک مزار کا متولی تھا۔ مگر زمانہ ہوا لوگوں نے مزار پر آنا جانا چھوڑ رکھا تھا، لوگ مزاروں کی بجائے وزیروں کے پاس جانے لگے تھے۔ وزراء مناسب کمیشن لے کر ہاتھوں ہاتھ کام کر دیا کرتے۔ مزاروں پر متولی ہی انہیں خوردہ دے کر رخصت کر دیا کرتا۔ ڈی لے ایکشن ڈیم کی طرح بڑا انتظار کرنا پڑتا۔ قاسم کا بیٹا اعلیٰ مستقبل کی تلاش میں کوئٹہ چلا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے بنا سفارش اسے چوکیدار کی نوکری مل گئی۔ وہ ماہ بہ ماہ قاسم کے لئے منی آرڈر بھیجا کرتا۔ قاسم اکثر غفار سے دریافت کرتا ''میرا منی آرڈر نہیں آیا''۔

غفار مسکرا کر جواب دیا کرتا۔ ''تقریباً دس تاریخ کو آیا کرتا ہے''۔ پیرانہ سالی اور دماغی ضعف کے ہاتھوں قاسم کچھ ایسا بھلکڑ ہو چکا تھا کہ ملاقات ہوتے ہی سوال دہراتا۔ ''دس تاریخ نہیں آئی''۔ پھر جانے کیا ہوا پانچ سو روپے کا منی آرڈر سکڑ کر دو سو کا رہ گیا۔ پھر کئی ماہ تک منی آرڈر ہی نہ آیا۔ ادھر قاسم بڑھاپے اور غربت کے

باعث کچھ باؤلا سا ہوتا چلا گیا۔

''تم میرے بیٹے کو خط پہنچا سکتے ہو؟ کوئٹہ میں ہے وہ۔''

غفار نے فخر سے سینہ تان لیا۔''ہم ڈاکخانے والے ہیں، ہم تو دنیا کے ہر کونے میں خط پہنچاتے ہیں۔تمہارا بیٹا چاند پر بھی ہوا تو خط پہنچا دیں گے۔مگر اس کا مکمل پتہ چاہیے جو تمہارے پاس نہیں۔ قاسم نے آسمان پہ نگاہ دوڑائی، وہاں دن میں چاند کہاں؟ مگر شائد اس کا بیٹا بھی چاند پر چوکیداری کرنے لگا تھا۔ ورنہ منی آرڈر نہ سہی خط ہی بھجوا دیتا۔

قاسم نے پہلی بار ہچکچاتے ہوئے غفار سے ڈاک کا لفافہ مانگا۔''ادھار دے دو، میں کسی کا ادھار نہیں کھاتا۔منی آرڈر آیا تو لوٹا دوں گا''۔

غفار کو خوشی محسوس ہوئی کہ قاسم میں زندگی کی کوئی علامت تو ظاہر ہوئی۔ ورنہ تو وہ چلتا پھرتا مزار محسوس ہوتا۔جس کا کوئی متولی نہ تھا۔ نام لیوا نہ پانی دیوا۔صنوبر کے مردہ درخت سا پڑا رہتا۔عید میں ہفتہ بھر باقی تھا کہ ڈاکخانہ زیارت میں ایک نرالا خط موصول ہوا۔ پیکر سائیکل پر جا کر دور دراز کے دیہاتوں کے وال لیٹر بکس کھول کر لفافے نکالتا۔ انہیں میل بیگ میں ڈالتا چلا جاتا۔بعض من چلے وال لیٹر بکس دیواروں یا درختوں سے اکھیڑ کر گھر لے جایا کرتے۔ ذرا کتر پینٹ کر کے ان کا اسٹوو بنا لیا کرتے۔ ڈاکخانے والے بھی سکھ کی سانس لیتے کہ چلو اچھا ہوا۔ایک لیٹر بکس کم ہوا۔ڈاک لانے کی زحمت سے بچے۔اطمینان سے آگے رپورٹ بھجوا دیا کرتے۔

پیکر نے حسب معمول میل بیگ ڈیلیوری روم کی سارٹنگ ٹیبل پر الٹ دیا اور دھڑا دھڑ ڈیٹ سٹمپ ٹکٹوں پہ مارنے لگا۔ جیسے جھوٹوں کو جوتے مارے جاتے ہیں، اس کا انداز مشینی تھا، صرف ایک ہی ڈیو بیگ کوئٹہ DMO جایا کرتا تھا۔ڈاکیے نے لفافے اکٹھے

کیئے تو چونک اٹھا۔چار روپے والے نیلے لفافے پر بھدی سے تحریر تھی۔''یا خدا، آسمان والے کے دربار میں جاوے''۔لفافے کی پشت پر مرقوم تھا''محمد قاسم سارنگ زئی۔ ڈومیارہ والا''۔ڈاکخانے میں کھلبلی مچ گئی۔ڈاکخانوں پہ ایک مرونی سی چھائی رہتی ہے۔جیسے سبھی مرحومہ ڈاک کی فاتحہ لینے کے لئے میز کرسی سجائے بیٹھے ہوں۔مارے حیرت کے دنگ رہ گئے۔لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔کسی کا لفافہ کھولنا یا اس پہ لگے ٹکٹ اتارنا ڈاکخانے کے قانون میں قتل سے بڑا جرم ہے۔مگر سب پوسٹ ماسٹر نور نے یہ مجاہدانہ کام کر ہی ڈالا۔لفافے میں ایک خط تھا۔جس پر اسی بھدی شکستہ تحریر میں لکھا تھا۔

''یا خدا۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں، مجھے جلد از جلد عیدی کا ایک ہزار روپیہ بھیج دے۔عید سے ایک دن پہلے منی آرڈر کر دے۔فقط تیرا بندہ محمد قاسم۔''

خط پڑھ کر ڈاکخانے میں خاموشی پھیل گئی۔عید قریب تھی۔ضروریات بے حساب تھیں۔ایسے میں نور نے اعلان کیا۔''میں چار سو روپیہ دوں گا''۔باقیوں نے بھی سو سو روپیہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔یوں سات سو روپیہ جمع ہو گیا۔اتنے میں کونے سے ایک جوان اٹھا، جو چپکے چپکے کسی خاتون سے فون پر باتیں کیئے جا رہا تھا۔سو روپیہ اس نے میز پر رکھ دیا۔یوں آٹھ سو روپے جمع ہو گئے۔منصوبہ یہ بنا کہ غفار پوسٹ مین جا کر یہ رقم قاسم کو دے گا کہ کہیں سے اس کا منی آرڈر آیا ہے۔قاسم تو مخبوط الحواس تھا، وہ نہ تو منی آرڈر فارم مانگتا نہ ہی کوئی سوال کرتا۔غفار نے یوں تو اس علاقے کا دورہ عید کے بعد ہی کرنا تھا۔مگر انسانی ہمدردی کے تحت اگلے روز روانہ ہو گیا۔کچھ خط بھی تھے اس علاقے کے۔سوچا کہ وہ بھی بانٹتا جائے ورنہ تو وہ خط عید کے لئے رکھے تھے کیونکہ ان دنوں عیدی بھی مل جایا کرتی۔سہ پہر میں قاسم کی کٹیا میں جا پہنچا۔اسے منی آرڈر کی رقم تھمائی۔اس سے فرضی رسید پہ وصولی کے دستخط بھی کرائے۔قاسم نے بے

یقینی سے رقم گنی۔ پھر غفار سے رقم گنوائی۔ کچھ ادھیڑ بن میں رہا۔ پھر نہایت ہی محبت سے ترخہ چائے غفار کو پلائی۔ ضد کر کے پہلے لفافے کے پیسے دیئے اور ایک نیا لفافہ بھی طلب کیا۔ غفار کو اس معصوم بزرگ پہ پیار آ رہا تھا جو قیمت چکانے پہ مصر تھا۔ ذرا ردو کد کے بعد غفار نے آٹھ روپے قبول کر لئے۔ کیونکہ قاسم کسی صورت مفت لفافے لینے پر تیار نہ تھا۔ بڑا ہی خوددار انسان تھا۔ انتہائی غربت کے باوجود ہاتھ پھیلانے کے خلاف تھا۔

ڈاک خانے والے بہت ہی خوش ہوئے۔ انہیں نیکی کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ذرا سی مالی قربانی دے کر قاسم کو بھی عید کی مسرتوں میں شامل کر لیا۔ عید کی چھٹیوں میں ڈاکخانہ کا پورا ہی عملہ کھسک گیا۔ باہر بیٹھے موچی کو ڈاکخانے کی چابیاں دے گئے کہ کوئی بھولا بھٹکا گاہک آئے تو اسے مطلوبہ سامان دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں کوئٹہ سے آنے والی بس سے روزانہ ڈاک کا تھیلا وصول کرتا رہے۔ ادھر سنجاوی، چوتیر سے آنے والی بس کو کوئٹہ DMO کا میل بیگ دیتا رہے۔ میل بیگ چونکہ ایک DUE بیگ ہوا کرتا ہے۔ ہر روز لازماً بھیجنا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ڈاک نہ بھی ہو تو خالی بیگ لازمی طور پر بھیجنا ہوتا ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے ترتیب وار خالی میل بیگ بھی رکھ دیئے کہ موچی روزانہ بیگ بھیجتا رہے۔ عید منا کر عملہ دس روز بعد لوٹا تو دیکھا کہ موچی نہایت خوش اسلوبی سے ڈاکخانہ چلاتا رہا۔ حالانکہ تھا ان پڑھ۔ سارٹنگ ٹیبل پر تھوڑی سی ڈاک پڑی تھی۔ جس میں عید میل نمایاں تھی۔ عملہ متحیر رہ گیا کہ خدا کے نام ایک خط اور بھی آیا ہوا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ اسی شکستہ تحریر میں شکایت تھی ''یا خدا ڈاکخانے والوں کو ہدایت فرما۔ تیرے بھیجے ہوئے منی آرڈر میں سے دوسو روپیہ کھا گئے۔ مجھے صرف آٹھ سو روپیہ ملا!!''

چاخو

بہت دنوں سے قسمت کی دیوی نوردین کے سر پہ بیٹھنے کو منڈلا رہی تھی مگر بٹلر کی وردی والی پگڑی رات گئے تک سر پہ منجمد رہا کرتی، سر بھی بار بار حاکموں کے سامنے خم کرنا ہوتا۔ اس پہ یہ التزام کہ پگڑی بھی گرنے نہ پاتی۔ یہی سرکاری ملازمت کا ملکہ ہے۔ جس میں نوردین ید طولیٰ رکھتا تھا۔ تھکا ہوا لشکر۔ گزان۔ توتک۔ درہ سوہند۔ گار ماپ۔ درہ مولہ۔ میر گٹ اور نورگامہ میں عسکری طاقت کا مظاہرہ کرتا سورگز کے چشمہ پر خیمہ زن تھا کہ طوفان باد و باراں نے آ لیا۔ بیل اونٹ تو زد میں تھے۔ گھوڑوں کو پناہ مل گئی کیونکہ دفعداروں۔ رسالداروں کی نظر میں وہ بے حد اہم تھے۔ تینوں گورے صاحبان بڑے خیمے میں تھے۔ جس کے باہر جمعدار بارش میں بھیگتے حفاظت پہ مامور تھے۔ خیمے کے اندر ہنڈے روشن تھے۔ میجر میک کوئن کو وہسکی کی طلب ہو رہی تھی۔ کیپٹن برنیئر اگرچہ بلانوش نہ تھا۔ مگر طلب اسے بھی ہو رہی تھی۔ نوردین کافی بنا کے لے آیا۔ میک کوئین نے شاہانہ انداز میں کہا۔ ''نوردین! اگر آج وہسکی لا دیتے تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دیتا۔ ایسا کہ تمہاری زندگی بدل جاتی۔''

نوردین نے حسبِ معمول سرخم کر دیا۔ ''اگر لا دوں تو وعدہ قائم رہے گا''، میجر میک کوئین کفاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اسکاٹش وعدہ کے پکے ہوا کرتے ہیں۔'' کیپٹن برنیئر سے برداشت نہ ہو سکا۔ ''اور انگریز بھی! تمہیں منہ مانگا انعام ملے گا''۔ چہل تن اور آماچ کی چوٹیوں سے تو ساگر امنڈ آئے تھے۔ خطرہ تھا کہ بار برداری کے جانور مارے جائیں گے۔ مستونگ کی آبادی کب کی سو چکی تھی۔ ہر طرف بادلوں کی گرج چمک تھی۔ اتنے میں نوردین ٹرے میں وہسکی کی پوری بوتل اور گلاس سجائے نمودار ہوا۔ سبھی افسران ششدر رہ گئے۔ ''واہ! کیا بات ہے۔'' میجر میک آرتھر اچھل پڑا۔ ''تمہارے پاس کیا جادو کا وہ چراغ ہے جس کی تلاش میں تم ہندوستانی رہتے ہو۔'' نوردین نے خوشدلی سے جواب دیا'' عالی جاہ بوتلوں میں بچنے والی شراب میں جمع کرتا چلا آیا۔ جس سے پوری بوتل تیار ہو گئی۔ میں ایماندار بھی ہوں اور آپ کا وفادار بھی۔'' افسر جھوم اٹھے۔ برفانی ہواؤں کے تند ریلے خیموں کو سہراب (سوراب) اور گدر کی جانب اڑا لے جانا چاہتے تھے۔ میجر نے فوراً چاندی کے پانچ روپے یکے بعد دیگرے قالین پہ پھینکے جو نوردین نے کوے کی مانند اچک لئے۔ تین تین روپے ساتھ کے دونوں افسروں نے بخشیش کہہ کر پھینک دیئے۔ وہسکی سے ذرا سردی کم ہوئی ذہن کھلا تو میک کوئین نے اعلان کیا'' آج سے بلکہ ابھی سے تم میس جمعدار ہو۔'' نوردین بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے فرطِ مسرت سے وہ حواس ہی کھو بیٹھا۔ یہاں حکم کی تعمیل فوراً ہی ہو گئی۔ وہ اچانک ہی ایاز سے محمود بن گیا۔ کوئٹہ چھاونی پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی شاداں کی منگنی توڑ دی۔ رفیق اور شاداں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ شاداں پونا ہارس رجمنٹ کی مانند جہاں جاتی مارتی کاٹتی نکل جاتی۔ گرم نگاہوں سے قتل کر دیتی۔ شرمیلی رسیلی اٹھکیلیاں کرتی۔ اس

کا تھرکتا، چھلکتا بدن سفید برقعے میں بھی موجیں مارنے لگتا۔ سپاہیوں کے دل حلق میں آنے لگتے اور مرتعش ہاتھوں سے بندوقیں گرنے لگتیں۔ سراپا آتش فشاں انگ انگ الگ بولتا، جیسے کوہ سلطان کا لاوا، جیسے بادرہ کے آگ اگلتے گندھک بھرے چشمے۔ رفیق غم و غصے سے پاگل ہو گیا۔ نوردین انگریزوں کو وہسکی پلانے والا کمبخت اس کے ہاتھوں سے سیل بند بوتل لے گیا۔ رفیق نے سماجی دباؤ ڈالا۔ کچھ گرائیں ہونے کا واسطہ دیا۔ تھے وہ ایک ہی علاقے سے۔ جانتے تھے کہ ملازمت سے ریٹائر ہو کر فیروز پور اور ماجھے میں اکٹھے ہی رہنا ہے مگر نئی وردی، نئے اختیارات بڑھیا تنخواہ گورے صاحبوں تک رات دن رسائی۔ غرضیکہ نوردین بیش پیشانی ہو گیا۔ رفیق ہار ماننے والا نہ تھا۔ وہ برابر دباؤ ڈالتا رہا۔ تب کہیں جا کر نوردین رضامند ہوا کہ اگر رفیق امیر ہو جائے رسالدار میجر بن جائے تو اسے بخوشی داماد بنا لے گا۔ اس معاہدہ کی رو سے منگنی کی مندری اور جوڑا ابھی واپس نہ ہوا۔ بدستور شاداں کی تحویل میں ہی رہا۔ شاداں سے بے اعتنائی کا گلہ کیا تو شان دلربائی سے بولی۔ ''تم بھی امیر بن جاؤ ناں۔ اڑیا مجھے امیر اچھے لگتے ہیں۔ مجھے قلات کے زیور اور سیس پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔ ڈھاڈر کے ہندو سناروں کی پہنچیاں اور سیوی کے بالے اور مکھر قندھاری بالشت اور ایران کا ریشمی کپڑا۔'' وہ مچل سی گئی۔

رفیق کو اس کم عمری میں ہندوستانیوں کیلئے سب سے بڑا تمغہ انڈین آڈر آف میرٹ مل چکا تھا۔ اس نے کردوں کے خلاف ایرانی بلوچستان میں بربریت کے مظاہرے کئے تھے۔ مگر شاداں کو بہادری کی نہیں دولت کی ضرورت تھی۔ رفیق نے کوٹان قلات۔ شیرنزہ۔ اور پہاڑی چیدگی پر معرکے میں بہادری کے مظاہرے کئے۔ پہاڑ سبز کوہ میں دست بدست لڑائی میں زخمی ہوا۔ راس کوہ کے درہ جانوروں میں بازو

پہ گولی کھائی۔مگر اب اسے دولت حاصل کرنا تھا۔وہ بھی محض ایک ہی برس میں۔وہ بندوق سے ایک منٹ میں پانچ فائر کرنے کی صلاحیت تو رکھتا تھا مگر شاداں کا دل جیتنا مشکل ہو چلا تھا۔رفیق کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ کسی لڑائی میں بہادری کے جوہر دکھائے اور انگریز اسے فوری ترقی دے دیں۔وہ دعا کیا کرتا کہ مینگل۔زرکزئی سمالاڑین۔یا رئیسانڑیں لشکری۔انگریزوں کا سامان رسد لوٹ لیں۔سپلائی لائن کاٹ ڈالیں تا کہ لڑائی کے امکانات پیدا ہوں۔میر محمود خان ثانی خان آف قلات بیلگر بیگی ریاست قلات میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔اس کے اپنے ریاستی مسائل کافی تھے۔جبکہ رفیق کو شوق تھا کہ وہ لڑتا ہوا سلما نجو یا ملخور تک جا پہنچے اور مور چوں پہ دھاوا بول دے۔اس کی آرزو تھی کہ کیپٹن برنیئر کو سرمچار زندہ پکڑ کے لے جائیں اور اسے محمد تاوہ۔اسپلنجی یا کرک میں قید کردیں اور رفیق خود چھڑا کر لائے۔وہ سردار لشکر خان اور اس کے بیٹے نور دین سے وڈھ کے کھلے میدانوں میں لڑائی کرے۔انگریز توسیع پسند تھے۔1876 کے معاہدہ میں انہیں بہت سے حقوق ملے تھے۔بولان ریلوے بچھانے کی اجازت بھی لے چکے تھے۔بلکہ بولان ریلوے برس ہا برس سے جاری تھی۔بولان ریلوے کے دونوں جانب دو دو سو گز کا علاقہ بھی برٹش بلوچستان کا حصہ شمال ہونے لگا تھا۔بولان ریلوے بچھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ریاست قلات کا علاقہ اس ریلوے لائن کے سبب مری قبائل کے حملوں سے محفوظ و مامون ہو گیا۔کیونکہ برٹش بلوچستان کے سپاہی ریلوے لائن کی دن رات حفاظت کیا کرتے۔لوگ خان آف قلات میر خدائیداد خان کی گرفتاری نہ بھولے تھے۔سردار بہادر خان ساسولی کی بغاوت بھی انہیں یاد تھی۔مگر انگریز ایک بڑی طاقت تو بہر حال تھے۔دنیاوی ترقی کے خواہاں خولا کی کوتل (کولپور) پہ انگریزوں سے اجازت نامہ حاصل کر کے کوئٹہ چلے

آتے۔جہاں سہولتیں بھی تھیں اور ترقی کے مواقع بھی۔رفیق کو یہ خوف بھی لاحق رہا کہ جس طرح براہوی سرمچار اچانک ویران پہاڑی سلسلوں سے نمودار ہو کر برطانوی لشکر پہ ٹوٹ پڑتے ہیں۔مارتے کاٹتے سامان رسد،گھوڑے،بار برداری کے جانور اور ہتھیار چھین کر وسعتوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔کسی دن کوئی امیر شخص گھوڑے پہ ڈنا برات لئے شاداں کی ڈولی نہ لے جائے۔اور وہ برطانوی بندوق تھامے دانت پیستا ہی رہ جائے۔

کیپٹن برنیئر 106 پلٹن۔دو توپ اور ایک ترپ رسالہ لے کر روانہ ہوا تو رفیق کی جان میں جان آئی۔قبائلی لشکر کے سامنے صف آراء ہوئے تو رفیق بے حد مسرور تھا۔قبائلی لشکر بظاہر تو کم دکھائی دے رہا تھا۔لڑائی نے زور پکڑا تو دائیں جانب سے گھڑ سواروں کا جتھہ نمودار ہوا جو برق بن کر برطانوی سپاہیوں پہ گرا۔گھمسان کا رن پڑا۔رفیق بے جگری سے لڑا جیسے گھوڑے کی زین پہ ساتھ بیٹھی شاداں رجز پڑھ رہی ہو۔گولیاں اس کے گھوڑے کو لگیں تو وہ زمین پہ آ رہا۔چابکدستی سے تلوار سونت کر شمشیر زنی کے جوہر دکھانے لگا۔لیکن چاروں طرف سے گھرا اور گھائل ہو کر زمیں پہ آ گرا۔ہوش میں آنے پر اسے دکھ ہوا کہ وہ قیدی بن چکا ہے۔شاداں کا ہاتھ چھوٹتا محسوس ہوا۔یہ تو اطمینان تھا کہ براہوی نہتے قیدیوں کو جان سے مارنا کسر شان سمجھتے ہیں۔قیدیوں کی مرہم پٹی ہوتی رہی اور اونٹوں پہ بندھے وہ ویران سے ویران تر علاقوں میں جا پہنچے۔قیدیوں کی تعداد ابتداء میں پندرہ تھی۔مگر زخموں اور سفری صعوبتوں کے باعث چھ نفوس راہ میں ہی دم توڑ گئے۔اس بستی میں انہیں مختلف کاموں پہ لگا دیا گیا۔گھوڑوں کو نعل لگانا۔بیل گاڑیوں کی مرمت کرنا۔تلواریں تیز کرنا قاشم کاٹ کاٹ کر لانا جو چٹائیاں بنانے کے کام آتا۔رفیق دیوار پہ لکیریں لگا لگا کر

دنوں کا حساب رکھا کرتا۔ غروب آفتاب سے سمت کا اندازہ تو ہوتا مگر اس لق ودق صحرا میں فرار کا مطلب تھا موت کو دعوت دینا۔ بغیر رہنما اور سواری کے یہ صحرا ناقابل عبور تھے سرمچاروں کے حسن سلوک کے باعث رفیق نے ان کی ایک بندوق بھی ٹھیک کر دی۔ برطانوی لشکر سے چھینی گئی بندوقوں کی وہ صفائی اور مرمت بھی کرتا رہا۔ جس کے باعث نکری نذر مینگل سے اس کی دوستی ہوگئی۔ برطانوی قانون کے مطابق دشمن کے اسلحہ کی مرمت صفائی اور نگہداشت بغاوت کے زمرے میں آتی۔ مگر کوئٹہ بہت ہی دور تھا۔ کون مخبری کرتا۔ بھلا کسے خبر ہوتی۔ اس نے نکری سے حال دل کہہ ڈالا۔ نکری نذر کا دل ایسا پسیجا کہ وہ فدیہ لیے بغیر ہی رفیق کو آزاد کرنے پہ آمادہ ہوگیا۔ مگر ایسی آزادی رفیق کو مہنگی پڑتی۔ برٹش افسر الٹا اسے ہی دھر لیتے۔ قبائلی ذرائع سے رہائی کی بات چیت جاری تھی۔ براہوی جانتے تھے کہ یہ بھانت بھانت کے لوگ کرائے کے سپاہی ہیں۔ جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے روزگار حاصل کرنے کے لئے چلے آتے ہیں۔ یہ قومی فوج نہ تھی جس کا اپنا نکتہ نظر ہوتا، وفا ہوتی۔ وہ تو کرائے کے قاتل تھے۔ ہر عرس پہ تالیاں پیٹنے والے قوال۔ مطالبہ تو پانچ سو روپیہ فی قیدی تھا مگر بات تین سو پہ آرکی۔ یہ رقم بعض کمزور قبائل کے خون بہا کے برابر تھی۔ واپسی پر وہ کورٹ مارشل سے بال بال بچے۔ انکوائری کے بعد انہیں ان کے عہدوں پہ تو بحال کر دیا گیا۔ مگر دولت مند بننے کے امکانات عنقا ہو گئے۔ ان ہی دنوں میجر میک کوئین فوج سے ریٹائر ہوگیا۔ اسے بمبئی جیسے اہم اور متمول شہر میں کمشنر کا عہدہ دیا گیا تھا۔

میک کوئن بنیادی طور پر کلکتہ اسکاٹش رجمنٹ کا افسر تھا۔ اس رجمنٹ کا MOTTO تھا۔

"PER ARDUA STABLIS ESTO"

وہ بنیادی طور پر سر پھرا انسان تھا۔ سکاٹ لینڈ کی برتری کا قائل تھا انگریزوں کو خاطر میں نہ لایا کرتا۔ رفیق اس کا معتمد خاص تھا۔ اسکورٹ میں بھی شامل تھا۔ درہ بولان۔ ہند بک اور سر بولان میں بالکل تنگ ہو جاتا ہے۔ جبکہ بعض علاقوں میں 55 میل کے قریب وسیع ہو جاتا ہے۔ باوجود دوستانہ معاہدوں کے انگریز محتاط انداز میں سفر کیا کرتے اتفاقاً اس روز بھی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ گھوڑوں کو زیر زمین اصطبل میں چھپا دیا گیا تھا۔ دوزان کی تباہ کن ہوائیں ہلاکت خیز تھیں۔ خیمے میں رفیق مسلح حالت میں ہاتھ باندھے کھڑا۔ تھا پی کر میک کوئین بہک سا گیا۔ ''بلوچستان پر قبضہ ہوسکتا ہے۔ میں کرسکتا ہوں۔ یہ نالائق انگریز کیا جانیں سردار بہادر خان ساسولی سے جنگ۔ مزار خان باجوئی کی کھلم کھلا بغاوت۔ میر حمزہ۔ جنگی خان۔ نور محمد باران زئی۔ ادھر سردار لشکر خان اس کا بیٹا نور دین مینگل۔ ادھر میر بلوچ خان نوشیروانی! کس کس سے لڑیں گے؟ اسکاٹ لینڈ نے بڑے بڑے جنگجو پیدا کیے جنہوں نے انگریزوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ میں کرسکتا ہوں بلوچستان پر قبضہ۔'' باہر زور کی بجلی چمکی وادی میں پرہیبت دھماکہ ہوا۔ جس سے گھوڑے بدک کر ہنہنانے لگے۔ رفیق نے جانا یہی وقت ہے جادوئی چراغ حاصل کرنے کا۔ ''میں تو عالی جاہ کا وفادار ہوں۔ حضور والا مجھے یہ راز بتائیں میں آپ کا جاں نثار ہوں۔'' وہ لجاجت پہ اتر آیا۔ میک کوئین ترنگ میں تھا۔ ''براہوی موت سے نہیں ڈرتے نہ ہی جنگوں میں زخمی ہونے سے آزاد فضاؤں میں رہتے ہیں چھتوں تلے انبار مکان بنا کے رہنا معیوب جانتے ہیں۔ آزاد فضاؤں، وسیع صحراؤں کے باسی ہیں۔ خانہ بدوش ہیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر سردی سے نہ لگی تو خیمے اٹھا گرم علاقوں میں چلے آئے۔ گرمی آئی تو اس سے سمجھوتہ نہ کیا۔ خیمے اٹھا سرد علاقوں میں چلے آئے، وہ تو موسم کی بات نہیں مانتے

انگریزوں کی کیا مانیں گے۔'' باہر گرج چمک بڑھ گئی۔ ہنڈے روشن تھے، خیمہ آرام وہ حد تک گرم تھا۔ میک کوئین اپنے میں کھو گیا۔ ''جوانی کے حسین دن بلوچستان میں گزارے ہیں۔ مجھے بلوچستان چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے۔''

''حضور! آپ بلوچستان پر قبضہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں''۔

''ہاں! براہوی ڈرتے تو نہیں۔ ہرگز نہیں مگر ڈرتے ہیں تو۔'' میک کوئن کی خاموشی جان لیوا تھی۔ کرک کی ٹہنیاں دھواں دے رہی تھیں۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ رفیق نے ہمت کی۔ ''کس سے ڈرتے ہیں۔ عالی جاہ؟'' میک کوئن درہ بولان میں لوٹ آیا۔ ''قید سے۔ بند ہونے سے۔ اگر مچ کے مقام پر درہ بولان کے اندر ایک جیل بنا دی جائے تو ٹرین کے مسافر، سڑک سے گزرنے والے، ٹرکوں والے، بسوں والے دیکھیں گے۔ تمام قافلے یہیں سے گزرتے ہیں۔ تمام خانہ بدوشوں کا یہی راستہ ہے۔ مچ کے مقام پر جیل بنانے سے امن آ جائے گا۔ انہیں بند ہونے کا خوف ہوگا آزادی کھونے کی دہشت ہوگی''۔

تزک و احتشام کے ساتھ اگلے روز میک کوئین ریل گاڑی میں سوار ہو کر کوئٹہ روانہ ہو گیا جہاں اسے الوداعی دعوتوں کے بعد رخصت کرنے کا اہتمام ہو چکا تھا۔ رفیق کو کامیابی کی کنجی مل چکی تھی۔ میک کوئین کے بمبئی پہنچنے کے بعد ہی اس نے یہ نسخہ ایجنٹ ٹو گورنر جنرل کے اجلاس میں اعلیٰ افسروں کو پیش کیا [illegible]ی پذیرائی ہوئی۔ پانچ ہزار روپیہ نقد انعام ملا۔ اگلی ترقی کی نوید بھی دی گئی۔ مچ میں زور شور سے جیل کی تعمیر ہونے لگی۔ نور دین لدھیانہ میں شاداں کی بات پکی کر چکا تھا۔ اس کے داماد خیر دین کا ٹسر اور لکھ ڈوری جیسے کپڑوں کی فیکٹری تھی۔ جبکہ رفیق مصر تھا کہ پانچ ہزار کی خطیر رقم سے شاداں پورے زیور تو کیا سونے کی میز کرسی بھی بنوا سکتی ہے۔ مگر نور دین ایک ہی

کائیاں نکلا اس نے شادی کی تاریخ بھی طے کر ڈالی۔ رفیق کا سپاہی پن جاگ اٹھا۔ اس نے دھمکی دی کہ وہ شاداں کو اٹھا لے جائے گا۔ نور دین نے پینترا بدلا۔ رفیق اور ٹکری نذر مینگل کی دوستی کا بھانڈا جا پھوڑا۔ انگریزوں کو بتایا کہ رفیق ان کا اسلحہ مرمت کرتا رہا ہے۔ اب بھی انہیں ایک آدھ بندوق یا پستول بھجوا دیتا ہے۔ رفیق کو فوراً لائن حاضر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ گرفتار رہنے والے سپاہیوں نے رفیق کے خلاف گواہی بھی دے ڈالی۔ بغاوت اور دشمن کو اسلحہ مہیا کرنے کا مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ 1927 میں مچ جیل مکمل ہوگئی۔ عملہ بھی متعین ہو گیا۔ مگر قیدی ندارد تھے۔ رفیق کو بغاوت اور تاج برطانیہ کے دشمنوں کی اعانت کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوگئی۔ اس پہ انکشاف ہوا کہ مچ جیل کا اولین قیدی بھی وہ خود ہی ہوگا۔ نور دین منتقم ذہن کا شخص تھا۔ انگریزوں کی سرپرستی کے باعث اس کی گدی گھوم گئی تھی۔ اس نے اسی ٹرین سے رفیق کو مچ بھجوانے کا انتظام کیا جس میں شاداں کی بارات جا رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر بینڈ سر الاپ رہا تھا۔ باراتیوں کے ملبوسات اور بلند شملوں سے سماں بندھ گیا تھا۔ رفیق شاداں پہ اکنیاں، دونیاں وارے جا رہا تھا۔ اسی گیٹ سے سپاہیوں کے ہمراہ رفیق داخل ہوا۔ پاؤں میں جولان اور ہاتھوں میں بیڑیاں۔ مگر رفیق کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ وہ سپاہیانہ شان سے سینہ تانے چل رہا تھا۔ رفیق کو تھرڈ کلاس میں بٹھا دیا گیا۔ باراتی ڈیوڑھے میں اور شاداں سیکنڈ کلاس میں۔ ہندوستانیوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ تو خیر دین مالدار انسان تھا۔ ٹرین رانی باغ۔ سدباب سپیزنڈ سے ہوتی ہوئی خڑلا کی کوتل میں داخل ہو کر مچ جا رکی۔ شاداں کھڑکی کا شیشہ اٹھا کر پلیٹ فارم کو لاتعلقی سے دیکھنے لگی۔ جس کے باہر بہت سے گھوڑے اور اونٹ مسافروں کے منتظر تھے۔ خیر دین چائے کا آرڈر دینے چلا گیا۔ اتنے میں رفیق

بھی سپاہیوں کی معیت میں جولان کے باعث سُست قدموں سے چلتا ہوا شاداں کی کھڑکی کے پاس آ پہنچا۔ شاداں نئی نویلی دلہن کسی منڈوے والی کی طرح سجی بنی اور زیوروں سے لدی پھندی کھڑکی میں حسن کی داد لے رہی تھی۔ رفیق مقابل آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو تکتے چلے گئے۔ ''یہ کیا ہو گیا رفیق'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ رفیق اس کے سحر میں ڈوب چکا تھا۔ سپاہی بھانپ گئے اور دلچسپی سے یہ انوکھا منظر دیکھنے میں محو ہو گئے۔ شاداں پھر پکاری۔ ''یہ کیا ہو گیا رفیق؟'' ایک سپاہی نے شاداں کی مشکل آسان کر دی۔ ''اس نے جو چاخو چلایا، وہ اس کے اپنے ہی دل میں لگ گیا''۔ ''خیر دین کو آتا دیکھ کر شاداں ہڑبڑا اٹھی'' اچھا۔ اچھا خدا حافظ'' اس نے سپاہیوں کو تنبیہ کی۔ ''لے جاؤ اسے جلدی کرو۔'' خیر دین کو کچھ یاد آیا شائد وہ آرڈر کو زیادہ پُر تکلف بنانا چاہتا تھا وہ پلٹ پڑا شاداں دوبارہ مہربان ہو گئی ''رک جاؤ ذرا! تم نے وہ میرے پانچ ہزار کیا کیے؟'' رفیق نے رکنا پسند نہ کیا ''وہ میں نے ٹکری نذر مینگل کو بھجوا دیے تھے کہ لڑائی جاری رکھے۔''

مچ: کھجور کا درخت

بیلگر بیگی: سرداروں کا سردار

جولان: پاؤں کی بیڑیاں۔ راہول

بیش پیشانی: گدھے جیسا ماتھا بجاز اً بے مروت سبز قدم

چاخو: چاقو